ماہنامہ مجلّہ

حیاتِ نو

اعظم گڑھ

JULY
1992

طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح متوجہ ہوں

آپ کو پہلے ہی یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ انجمن طلبہ قدیم کا پانچواں اجلاس عام ۲۸ تا ۳۰ اکتوبر ۱۹۹۲ء کو مادر علمی میں ہونے جا رہا ہے۔ اسی سلسلے میں درج ذیل امور کی طرف فوراً توجہ کریں۔

۱۔ اپنے پتے سے دفتر انجمن طلبہ قدیم کو فوراً مطلع کریں۔
۲۔ ایک فارم معلومات طبع کروایا گیا ہے۔ مقامی یونٹوں کو روانہ کر دیا گیا ہے۔ وہاں سے حاصل کر کے یا براہ راست دفتر انجمن سے حاصل کر کے خانہ پری مکمل کرنے کے بعد جلد از جلد دفتر انجمن کو روانہ کریں۔
۳۔ اجلاس کے اندر ایک مقالہ بعنوان "فارغین جامعہ ایک نظر میں" پیش کیا جائے گا۔ اس کی تیاری کے سلسلے میں آپ تمام کا بھرپور تعاون درکار ہے۔ لہٰذا آپ اپنے سلسلے میں پوری تفصیلات خصوصاً ہر طرح کی خدمات کی تفصیلات سے جلد اور ضرور دفتر انجمن کو باخبر کریں خواہ وہ خدمات علمی ہوں، تدریسی ہوں، تحریکی ہوں، رفاہی ہوں وغیرہ
۴۔ اجلاس کے سلسلے میں اپنے مشوروں سے آگاہ کریں۔

(سکریٹری انجمن)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح کا ترجمان

ماہنامہ مجلہ

حیات نو

بلریاگنج

جلد ۷ محرم الحرام ۱۴۱۳ھ / جولائی ۱۹۹۲ء شمارہ ۷

بدل اشتراک

سالانہ زرتعاون:	۵۰ روپے
طلبہ کیلئے:	۴۰ روپے
خصوصی زرتعاون:	۱۰۰ روپے
اعزازی زرتعاون:	۱۰۰۰ روپے
غیر ممالک سے زرتعاون:	۲۵ امریکی ڈالر
قیمت فی شمارہ:	۵ روپے

اس دائرہ میں سرخ نشان کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو چکی ہے۔ لہٰذا چندہ جلد روانہ فرمائیں۔

مدیر مسئول

نور محمد فلاحی

مدیر
محمد اسمٰعیل فلاحی

معاون مدیر
عبد الباری فلاحی

سرکولیشن منیجرس
محمد اشفاق عالم فلاحی
آفتاب رحمانی فلاحی

مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ

دفتر ماہنامہ مجلہ "حیات نو" جامعۃ الفلاح بلریاگنج اعظم گڑھ یوپی ۲۷۶۱۲۳

شاطر آفسٹ پریس ناظرہ نیشنل آباد یوپی

نقوشِ حیاتِ نو

		صفحہ
اداریہ		
دو واقعات	ا، ف، فلاحی	۳
بحث و نظر		
حذف	خالد مسعود	۲۶
عظمت کے مینار		
مولانا ابو اللیث اصلاحی ندوی کی شخصیت کے چند نمایاں پہلو۔	سلطان احمد اصلاحی	۷
تاریخ کے جھروکوں سے		
سلطان ٹیپو کے نام نپولین کا خط	پروفیسر ریاض حسین	۲۰
گوشۂ ادب		
احمد امین اور ان کی خود نوشت سوانح حیات	صفدر سلطان اصلاحی	۳۱
شعر و نغمہ		۳۹
غزل	ادریس ضیاؔ	
دل مضطرب ہے سینوں میں	ریاض احمد قاصد	
تعارف و تبصرہ		۴۰
کرنیں	محمد عمران خان فلاحی	
اخبار علمیہ		۴۴
جامعۃ الفلاح میں ایک اہم سمینار	ابن عالم فلاحی	
لندن ہائی کورٹ کا خوش کن فیصلہ		
جامعہ کے لیل و نہار		۴۶
جلسۂ عام، انجمن طلبہ قدیم کی طرف سے پیشکش، مولانا نعیم الدین اصلاحی کو صدمہ،	نور محمد فلاحی	

ادارِیہ — ا، ف، فلاحی

دو واقعات

"انسان اس خوش فہمی میں مبتلا ہے کہ وہ وقت کو کاٹتا ہے لیکن حقیقتاً وقت انسان کو کاٹتا رہتا ہے۔ وقت کے متعلق کسی نے بڑی اچھی بات کہی ہے۔ وقت انسان کو کس طرح اور کتنی تیزی سے کاٹتا ہے اسکا احساس اسکو نہیں ہے۔ اسکا اندازہ سانس کی آمد و رفت سے کر سکتے ہیں یا گھڑی میں حرکت کرتی سکنڈ کی سوئی سے بلکہ خدا کی کائنات میں تو اس سے زیادہ تیز رفتار چیزیں مثلاً روشنی ایک سکنڈ میں ایک لاکھ چھیاسی ہزار کلومیٹر کا سفر طے کرتی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وقت کتنی تیزی سے گذر رہا ہے۔

ابھی چند سال پہلے جب پندرہویں صدی ہجری کا آغاز ہوا تھا تو پوری دنیا میں مسلمانوں نے بڑے جوش و خروش کے ساتھ اس کا استقبال کیا تھا اور عہد کیا تھا کہ ہم اب اسلام کیلئے کام کریں گے اور ہمارا اٹھنا بیٹھنا سونا جاگنا زندگی اور موت سب اسلام کے لئے ہوگی اور اس کو ہم انشاء اللہ غلبہ اسلام کی صدی بنائیں گے۔ مسلمان اپنے اس عہد کو کہاں تک پورا کر رہے ہیں وہ اپنا خود جائزہ لیں اور اپنا احتساب کر کے بتائیں البتہ ہم کو اتنا ضرور محسوس ہو رہا ہے کہ اس عظیم مقصد کے لئے جس طریقے سے جد و جہد کرنا چاہئے ہم نہیں کر رہے ہیں۔

وقت بڑی تیزی سے گذر رہا ہے۔ منٹ گھنٹوں میں، گھنٹے دنوں میں اور دن مہینے اور سالوں میں بڑی تیزی سے تبدیل ہو رہا ہے اور آج ہم پھر ایک نئے سال ہجری میں داخل ہو گئے ہیں۔ محرم کا مہینہ جب آتا ہے تو بہت سے واقعات ذہن کے پردے پر تیزی سے دوڑنے لگتے ہیں۔ آج ہم صرف دو واقعات کی طرف توجہ مبذول کرائیں گے

آج سے ٹھیک ۱۴۰۰ سال پہلے عرب کی سرزمین میں ایک ایسا یادگار اور دور رس واقعہ پیش آیا جو تا قیامت واقعات کی تاریخ میں ایک سنگ میل بن گیا۔ جو یہ کہ سرور کائنات خاتم الانبیاء رسول مقبول محمد بن عبد اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کے دین کی اشاعت و تبلیغ کیلئے جب مکہ کی سرزمین میں تحریک

کی داغ بیل ڈالی اور جدوجہد کا آغاز کیا تو بڑے بڑے چودھریوں کے کان کھڑے ہو گئے اور جیسے جیسے یہ قافلہ آگے بڑھتا گیا مصائب و مشکلات ابتلاؤ آزمائشیں بھی بڑھتی گئیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے رفقاءؓ انہیں خندہ پیشانی سے برداشت کرتے رہے طعنے سنا، گالیاں کھائیں، قید رہے، فاقہ کیا، اور طائف کی وادیوں میں مبارک جسم پتھروں سے لہولہان ہوا اور پھر کفار و مشرکین نے قائد تحریک اور سرور عالم کو ختم کرنے کا پلان بنایا اور ننگی اور خون کی پیاسی تلواریں اسلام کے چراغ کو بجھانے کیلئے میانوں سے نکل آئیں۔

کیسا عجیب رہا ہوگا وہ لمحہ جب دنیا جہاں کے سب سے بہتر انسان وقت کے نبی اور خدا کے لاڈلے اور پیارے بندے کو کچھ بدبخت نکالنے کی تیاری کر رہے ہونگے اور کچھ خوش بخت اور نیک طبیعت انسان اس کے استقبال کی تیاری۔ کچھ ننگی تلواریں اقتدار قوت و طاقت کے نشے میں انکے گھر کا محاصرہ کئے ہوئے ہونگے اور کچھ ایمان و یقین سے معمور اپنی جانیں چھڑکنے کیلئے بے چین ایک جاں نثار انکے بستر پر امانتیں واپس کرنے کیلئے لیٹا ہوگا اور ایک نے غار ثور میں رفاقت کی ہوگی۔ کسی نے بکریوں کا دودھ پلایا ہوگا اور کسی نے اپنا نطاق پھاڑ کر اس کا ناشتہ باندھا ہوگا۔

کیسا رہا ہوگا وہ وقت جب انصار کی چھوٹی چھوٹی بچیاں اپنے محبوب اور پیارے نبی کو پاکر محبت کا ترانہ گنگنایا ہوگا۔

طلع البدر علینا۔۔ من ثنیات الوداع
وجب الشکر علینا۔۔ ما دعا للہ داع

اور کیسا اضطراب انگیز رہا ہوگا رات کا وہ پچھلا پہر جب عباس بن عبادہ بن نضلہ نے اٹھ کر انصار سے کہا ہوگا۔۔ جانتے ہو اس شخص سے کس چیز پر بیعت کر رہے ہو؟ آوازیں ہاں جانتے ہیں تم انکے ہاتھ پر بیعت کر کے دنیا جہاں سے لڑائی مول لے رہے ہو پس اگر تمہارا خیال یہ ہو کہ جب تمہارے مال و اسباب تباہی کے اور تمہارے اشراف ہلاکت کے خطرے میں پڑ جائیں گے تو تم اس کو دشمنوں کے حوالے کر دو گے تو بہتر ہے کہ آج ہی اسے چھوڑ دو کیونکہ خدا کی قسم یہ دنیا و آخرت کی رسوائی ہے اور اگر تمہارا خیال یہ ہے کہ جو بلاوا تم اس شخص کو دے رہے ہو اسکو اموال کی تباہی اور اشراف کی ہلاکت کے باوجود نباہو گے تو بیشک اس کا ہاتھ تھامو

خدا کی قسم یہ دنیا و آخرت کی بھلائی ہے۔۔۔

اس پر تمام وفد نے کہا۔ ہاں ہاں۔ ہم اسے لیکر اپنے اموال کی تباہی اور اپنے اشراف کی ہلاکت کے خطرے میں ڈالنے کے لئے تیار ہیں۔

یہ ہجرت کا دیباچہ اور اس پورے واقعہ کو واقعہ ہجرت کہتے ہیں۔ کیا ہجرت کے اس نئے سال کے آغاز پر ہمارے لئے یہ مناسب نہیں کہ ہم پھر یہ عہد وفا باندھیں کہ ہم خدا کے دین کی حفاظت کیلئے اپنے اموال کی اور اپنے اشراف کی تباہی و ہلاکت برداشت کریں گے اور تنگی اور فراخی مصیبت و راحت ہر حال میں خدا و رسول کا ساتھ دیں گے۔۔ یقیناً یہ بڑا مبارک موقع ہے کاش ہماری قوم تجدید عہد کر لیتی۔

محرم کا دوسرا واقعہ بھی تاریخ کا ایک عظیم سانحہ ہے ۱۰ محرم ۶۱ھ کی صبح یقیناً مسلمانان عالم کیلئے کوئی اچھی صبح نہ تھی جب کربلا کے میدان میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نور نظر علیؓ کا لخت جگر اور فاطمہؓ کا جگر پارہ اپنے اہل و عیال کے ساتھ عمر بن سعد کی تیس ہزار فوجوں کے گھیرے میں تھا مصالحت کی ساری کوششیں بے کار ہو گئی تھیں دشمن یزید کی بیعت یا حسینؓ کے خون سے کم کسی چیز پر راضی نہ تھا۔ ایک طرف ۷۲ جاں نثار تھے اور دوسری طرف ہزاروں کا لشکر صفیں ترتیب دے دی گئیں۔ عمر بن سعد نے پہلا تیر چلایا اور جنگ کا آغاز ہو گیا جاں نثاران حسینؓ ایک ایک کر کے شہید ہوتے رہے اور اب علی اکبر کی باری تھی۔

کتنی سوگوار رہی ہوگی وہ فضا اور کتنا دردناک رہا ہوگا وہ منظر جب اکیلا حسینؓ تیس ہزار سواروں سے بھوکا پیاسا اس حال میں لڑ رہا ہوگا کہ اسکی عورتیں اور بچے اسکے قریب تنہا بے یار و مددگار اور غیر محفوظ پڑے ہونگے اور اسکے ساتھی اور جاں نثار ایک ایک کر کے اسکی آنکھوں کے سامنے جام شہادت نوش کیا ہوگا اور پھر خود حسینؓ بھی لڑتے ہوئے اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دیا ہوگا اس کا جسم نیزوں اور تلواروں کے زخموں سے بھر گیا ہوگا اس کا سر کاٹ کر جدا کر دیا گیا ہوگا اور جسم پاک گھوڑوں کی ٹاپوں سے روند ڈالا گیا ہوگا۔

حضرت حسینؓ کی یہ شہادت واقعہ کربلا کے نام سے موسوم ہے یہ شہادت دین کی ایک عظیم قربانی تھی جو دین کے اندر ایک بڑی تبدیلی اور بگاڑ کو روکنے کے لئے دی گئی تھی

تاریخ کے اس عظیم واقعہ کی یاد ہر سال منائی جاتی ہے اور لاکھوں فرزندان اسلام حضرت حسینؓ سے اپنی محبت اور وابستگی کا اظہار کرتے ہیں۔ اور یہ زمین و آسمان جب تک قائم رہیں گے، چاند اور سورج جب تک طلوع و غروب ہوتے رہیں گے حسینؓ کی قربانی دلوں کو گرمی اور حرارت عطا کرتی رہے گی۔

نواسہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے دین کی مظلومیت اور اسلامی اقتدار کی پامالی دیکھی اور انھوں نے اسکو روکنے کیلئے نہ صرف اپنی بلکہ اپنے اہل و عیال کو بھی قربانی کیلئے پیش کر دیا۔ آج پھر مظلوم دین ہم سے جان مال کی قربانی سے کم کسی چیز کا مطالبہ نہیں کر رہا ہے کیا ہم۔ حضرت حسینؓ کے نقش قدم پر چلنے کے دعویدار ...... اپنا سب کچھ قربان کرنے کیلئے تیار ہیں ...... کیونکہ بقول کسے اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد۔

بقیہ۔ ابو اللیث اصلاحی ندویؒ شخصیت کے ......

تنہائی کا ہر لمحہ اور جبکہ اسکے ساتھ بیماری بھی لگی ہوئی ہو تو اسکی کربناکی اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ لیکن مولانا کی بے مثال اور باہمت شخصیت نے اس پر اس طرح قابو پالیا کہ گویا کہ یہ کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ دہلی سے رخصت ہوتے وقت غالباً کسی نے سوال بھی کیا کہ مولانا دہلی کے بعد گاؤں کی زندگی میں آپ تنہا کیسے رہیں گے۔ جواب ملا کہ میں خود انجمن ہوں۔ تنہائی کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ دنیا سے بے پروائی اور اللہ سے بڑھے ہوئے تعلق کی بدولت انسانؐ کے اندر جو بے مثال خوبیاں پیدا ہو جاتی ہیں وہ بے نیازی اور باہمتگی اسکا نمایاں ترین پہلو ہے۔ مجلس اور انجمن کیا گھر اور خاندان بھی ساتھ نہ رہ جائے تو کیا پرواہ۔ خدا کی مرضی اور مشیت ہر چیز پر مقدم ہے۔ مومن بھی وہ کیا جسکی نگاہوں میں محدود زمان و مکان بالکل ایک ہو کر نہ رہ جائے۔ اس زمانہ میں یقیناً بزم و انجمن کا زیاں بھی شامل ہے کوئی ہو نہ ہو خدا ساتھ ہو تو پھر کیا کمی ہے۔ ہم کلامی کیلئے اس کی کتاب موجود ہے۔ تعلق باللہ کی یہ نعمت عظمیٰ جسے حاصل ہو اس کیلئے ماحول اور تنہائی کبھی مسئلہ نہیں بن سکتی۔ مولانا کے عمل نے بتا دیا کہ اس نعمت کا حصہ وافر اس بارگاہ عالی سے آپ کو عطا کیا گیا ہے۔

مولانا ابو اللیث اصلاحی ندوی رحمۃ اللہ علیہ
شخصیت کے چند نمایاں پہلو

اللہ تعالیٰ جب کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو اسکی محبت ملاء اعلیٰ تک منتقل ہو جاتی ہے اور وہاں سے اسے روئے زمین پر منتقل کرنے کا حکم دیدیا جاتا ہے کہ لوگو! اللہ تعالیٰ اپنے فلاں بندے سے محبت کرتا ہے تو تم بھی اس سے محبت کرو۔ صحیح مسلم کی روایت کردہ اس حدیث نبوی کا مصداق قریب کے دور میں مولانا ابو اللیث صاحب اصلاحی ندویؒ متوفی ۱۷ جمادی الاولی ۱۴۱۱ھ مطابق ۵ دسمبر ۱۹۹۰ء دس بجے صبح بمقام حاجی مشتاق ہسپتال، شہر اعظم گڑھ کی شخصیت کو قرار دیا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ جو اپنے بے پناہ اخلاص، ایثار، نفسی اور گوناگوں علمی اور انتظامی صلاحیتوں کی بدولت قریب نصف صدی کے عرصہ تک ہندوستان کے دینی و سیاسی افق پر چھائے رہے اور لاکھوں فرزندان توحید کے دلوں میں اپنی جگہ بنائے رہے مولاناؒ کی ہمہ گیر، ہمہ پہلو شخصیت، اور خاص طور پر آزاد ہندوستان میں تحریک اسلامی کے بے لوث خادم کے آپ کی عظیم خدمات کے تذکرے اور جائزے کے لئے ایک مضمون نہیں بلکہ پوری کتاب کی ضرورت ہے۔ سطور ذیل میں محض آپ کی یاد تازہ کرنے اور آپ کی بے لوث شخصیت سے تحریک اور روشنی حاصل کرنے کے پہلو سے اس کے بعض نمایاں پہلوؤں کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

موجودہ حالات میں دینی و ملی نقطہ نظر سے بھی اسکی ضرورت کا احساس ہوتا ہے ملت کی نئی نسل اپنے اکابر کی خدمات اور قربانیوں سے بڑی حد تک ناواقف ہے۔ نوجوانوں میں جنریشن گیپ جیسے بہت سے مسائل بہت حد تک اس ناواقفیت کے پیدا کردہ ہیں۔ تاریخ کے تسلسل کے پہلو سے بھی یہ ایک اہم ترین ضرورت ہے، ورنہ اگر بعد کی نسلیں اپنے اگلوں سے صحیح طور پر واقف اور بہ وجوہ انکی وارث اور امین نہ بن سکیں تو قومی اور ملی حیثیت سے

یہ مقالہ مولانا مرحوم کی حیات میں اس وقت لکھا گیا تھا جبکہ مولانا حیات تھے اب جبکہ مولانا ہمارے درمیان نہیں رہے مناسب ترمیمات اور بعض اضافوں کیساتھ دوبارہ اشاعت کیلئے دیا جا رہا ہے ۱۹۹۶ء میں اسکے پس منظر کا کسی قدر اندازہ اسکے مندرجات سے کیا جا سکتا ہے۔ (ص)

یہ ایک ایسا خلا رہتا ہے جس کے ہوتے ہوئے توازن و ہم آہنگی اور صحت مند قوتی اور افکار کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔

علمی کیریر کی قربانی

اس پس منظر میں مولانا اصلاحی ندویؒ کی شخصیت پر نظر ڈالی جائے تو ان کے متعدد پہلو سامنے آتے ہیں جو بے اختیار اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ اس سلسلے میں پہلی نمایاں چیز مولانا ممدوح کی اپنے علمی کیریر کی قربانی ہے۔ یوں تو موصوف کی پوری زندگی قربانیوں سے عبارت ہے مدت عمر اپنے لئے کچھ کرنے کے بجائے وہ صرف دین اور ملت کی خاطر جیے۔ دنیا کی متاع غرور ایک لمحہ کیلئے بھی انہیں اپنی طرف متوجہ نہ کرسکی دین کی راہ میں آپ نے ہر طرح کی مصیبتیں اور پریشانیاں جھیلیں، یہاں تک کہ متعدد بار قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔ اور ایک دو سال نہیں پوری چوتھائی صدی انہیں صعوبتوں اور آزمائشوں کے بیچ گزار دی۔ لیکن سچ یہ ہے کہ ان سب قربانیوں سے بڑھکر مولانا کی اپنی علمی زندگی اور اکیڈمک کیریر کی قربانی تھی۔ مولانا مدرسۃ الاصلاح اور ندوۃ العلماء سے اپنی تعلیم مکمل کرنے کے ساتھ ہی علمی دنیا میں قدم رکھ چکے تھے۔ اور اپنے مختلف اور متنوع مضامین کے ذریعہ جس کا سلسلہ دور طالب علمی ہی سے شروع ہو چکا تھا آپ علمی حلقوں میں متعارف ہو گئے تھے اور اہل علم میں آپکی نگارشات کو خاص دلچسپی اور توجہ سے دیکھا جاتا تھا۔

فراہی مکتب فکر کی وابستگی کے زمانہ میں قرآن شریف سے مولانا کو خصوصی ربط تھا۔ مولانا مناظر احسن گیلانی جنہوں نے جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن میں شعبۂ دینیات سے وابستگی کے زمانہ اس صدی کے عظیم مفسر قرآن مولانا حمید الدین فراہیؒ سے کسب فیض کیا تھا انکی صحبت کے نتیجے میں مولانا اصلاحی کے ذوق قرآن فہمی کو مزید جلا ملی۔ اور قرآنیات آپ کی علمی و فکری کاوشوں کا خاص محور بن گئیں۔ اگر کسی معاصر کا اپنے ہم عصر کے لئے اعتراف حقیقت کا سب سے بڑا اعتراف ہے تو اس دور کے انتہائی مخلص اور سنجیدہ اہل علم مرحوم مولانا مسعود عالم ندویؒ کا مولانا موصوف کے سلسلے میں یہ اعتراف بڑی اہمیت کا حامل بن جاتا ہے کہ والاستاذ ابو اللیث من لهم نظر ثاقب في معارف القرآن والاطلاع واسع على مقتضيات العصر، وهو بعد ذلك من العاملين المخلصين الذين قلما يوجد لهم نظير في مثل هذا الزمان الحالك [1]

[1] تاریخ الدعوۃ الاسلامیۃ فی الہند/۲۹۹، ۳۰۰ مطبوعہ ۱۳۷۲ھ۔

مولانا ابو اللیث ان لوگوں میں سے ہیں جن کی قرآنی حقائق و معارف پر گہری نظر ہے۔ ساتھ ہی زمانہ کے تقاضوں سے بھی آپ پوری طرح باخبر ہیں۔ اس کے علاوہ سب سے بڑی بات یہ کہ آپ دین و ملت کے بے لوث خادم ہیں جبکہ آج کے تاریک دور میں اسکی بڑی ہی کمی محسوس ہوتی ہے مولاناؒ کے انتقال کے بعد شائع ہونے والے مضامین میں آپ کے استاذ گرامی جناب علامہ تقی الدین ہلالی مراکشی صاحب کا یہ تاثر بھی ایک سے زائد بار نقل ہوا کہ: کان خیر محمد اذکی من علی، شبیر محمد (مولانا کا پہلا نام محمد مولانا سید ابو الحسن علی ندوی) سے زیادہ ذہین تھے (اس کے ایک حوالہ کیلئے ماہنامہ اسلامک موومنٹ، جنوری ۱۹۹۱ء یاد رفتگاں کے زیر عنوان مولانا ابو اللیث اصلاحی ندویؒ از ابو عطیہ اصلاحی) شاگرد کے حق میں کسی استاد کی یہ شہادت اور سند جس اہمیت کی حامل ہوسکتی ہے اس کے سلسلے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔

تحریری اور صحافتی ذوق مولانا کا فطری تھا، چنانچہ مدرسۃ الاصلاح اور ندوہ میں اپنی تعلیم مکمل کرنے کے ساتھ ہی آپ اپنے وقت کے مشہور اخبار مدینہ بجنور، اور اسی جگہ سے شائع ہونے والے دوسرے ماہنامہ فاران کی ادارت سے منسلک ہو گئے۔ اور اس حیثیت سے آپکی شہرت ملک کے طول و عرض میں پھیل گئی۔ گہرائی کے ساتھ سنجیدگی اور متانت جو آپ کی شخصیت کا نمایاں ترین وصف ہے، اس دور کی آپ کی نگارشات میں بھی اسی طرح نمایاں تھی۔ قیام بجنور کے اس زمانہ میں صحافتی مضامین کے علاوہ فراہی مکتب فکر کے نمائندہ بعض انتہائی اہم اور طویل مقالات بھی سپرد قلم کئے۔ زندگی کے آخری دور میں بھی راقم السطور نے مولاناؒ کی زبانی ان مضامین کا چرچا سنا۔ اپنی زندگی کے اس دور اول کے بعد آپ درس و تدریس کی مصروفیات کے ساتھ ٹھوس علمی کام اور خاص طور پر قرآنیات کی طرف یکسو ہو گئے۔ اس سلسلے میں آپ کے ذہن کی جودت اور مضامین کی ندرت کا اندازہ، مرحوم الاصلاح سرائمیر ۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۹ء اور اس وقت کے ترجمان القرآن حیدرآباد اور پٹھان کوٹ میں مواعظ عبر، اور موعظۂ حسنہ وغیرہ مستقل عنوانات کے علاوہ آپ کے انتہائی اہم اور دقیق قرآنی مضامین اور قرآن میں تکرار کی نوعیت اور قصۂ آدم و شیطان قرآن مجید اور تسبیح، قرآن اور ترتیب، اسماء انبیاء کرامؑ اور قصۂ حضرت یوسف، قرآن اور تورات کے بیانات کا موازنہ وغیرہ سے کیا جاسکتا ہے، بلکہ سچ یہ ہے کہ فراہی مکتب فکر کے تتبع کے ساتھ

ان مضامین میں جدت و ابتکار کی نمود ملتی ہے گو کہ آپ اپنے معاصرین ہی نہیں اپنے اساتذہ میں بھی ممتاز نظر آتے ہیں۔ آخری مضمون "قصۂ یوسف" پر مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے اپنی زبردست پسندیدگی کا اظہار مضمون نگار سے تحریری طور پر کیا تھا۔ اور لکھا تھا کہ ندویت کو معروف ثابت کرنے کیلئے تنہا یہ مضمون ہی بہت کچھ کافی ہے۔ مولاناؒ نے ایک موقع پر مرکز جماعت میں مولانا گیلانیؒ کے اس خط کے بعض اقتباسات خود پڑھ کر سنائے۔ اس معذرت کے ساتھ کہ مولانا گیلانی بڑی مبالغہ آرائی سے تعریف کرنے کے عادی تھے۔ اور یہ کہ تم کو اس خط سے مناسبت نہ ہوگی اور خود اس کو پڑھنے میں زحمت ہوگی۔ اردو کے ساتھ عربی صحافت اور انشاپردازی کا مولانا کا ذوق ویسا ہی ستھرا اور طبعی تھا۔ ندوہ سے نکلنے والا اپنی نوعیت کا ممتاز واحد عربی ماہنامہ مجلہ الضیاء میں آپ کے مضامین برابر نکلتے اور کافی پسند کئے جاتے تھے۔ مولانا کی یہی گوناگوں علمی خصوصیات تھیں جن کی وجہ سے آزادی کے بعد ہندوستان میں اپنی نوعیت کے ممتاز و منفرد علمی و تحقیقی ادارے دارالمصنفین، اعظم گڑھ کے سربراہ، وقت کے سب سے بڑے محقق اور مصنفین کے سرخیل علامہ سید سلیمان ندویؒ نے مختلف اسباب سے پاکستان منتقل ہونے کا فیصلہ کیا تو انکی جانشینی کیلئے جن شخصیتوں کے نام زیر غور آئے، ایک روایت کے مطابق، مولانا اصلاحی ندوی کا نام نامی ان میں سرفہرست تھا۔

لیکن ۱۹۴۸ء میں جب ملک کی تقسیم کے بعد ہندوستان میں تحریک اسلامی کی تنظیم نو عمل میں آئی، مولانا ابو اللیث اصلاحی ندوی کی زندگی نے بھی ایک نیا رخ اختیار کر لیا۔ مولانا اصلاحی جو اس سے بہت پہلے سے تحریک سے وابستہ ہو چکے تھے اور اس کے ایک سرگرم رکن تھے انہیں متفقہ طور پر ہندوستان میں تحریک اسلامی کا امیر منتخب کیا گیا۔ یہ عجیب توارد تھا جسے بزرگوں کے ہاں عنداللہ حسن قبول کی دلیل کہا گیا ہے کہ پاکستان میں بانی جماعت مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ کے دور اپنے سینئر رفقاء کی رائے بھی، مولانا مرحوم کے ہی حق میں تھی، اگرچہ اسکی اطلاع یہاں انکے بعد ہی پہنچی۔ ۱؎ بہر حال مولانا کی پہلے ہی سے متحرک اور سرگرم زندگی میں یہ ایک نئے باب کا آغاز تھا۔ جس کا سب سے اہم اور نمایاں رخ تھا کہ آپ کو اپنے سابقہ ممتاز علمی کیریر کی قربانی دے کر تصنیف و تالیف اور لکھنے پڑھنے کے محبوب و مانوس کام کی جگہ دعوتی اور تبلیغی زندگی اور ملت کی قیادت و رہنمائی

۱؎ مزید تفصیل کیلئے اپنے انتقال سے کچھ ہی دن قبل شائع کردہ اپنی دستاویزی یادداشت "تشکیل جماعت اسلامی ہند کیوں اور کیسے"، صفحات ۵ تا ۱۰، مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی، اگست ۱۹۹۰ء بار اول۔

کی ذمہ داریاں بار گراں اور پر خطر مہم کیلئے محسوس کرنا تھا۔ اس کا صحیح اندازہ اس میدان کے لوگ ہی کر سکیں گے کہ یہ علمی شخصیت کی یہ قربانی اس کی زندگی کی سب سے بڑی قربانی ہے، جس کا کم تصور کیا جا سکتا ہے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ مولانا جنکی پوری زندگی ہی قربانیوں سے عبارت ہے جیسا کہ آگے ہم اس پہلو پر ایک طائرانہ نظر ڈالیں گے، اس کا آغاز ہی علمی کیریر کی سب سے بڑی قربانی سے ہوا، ہر چند کہ حیثیت کا یہ فیصلہ دین و ملت کے پہلو سے بڑا بابرکت ثابت ہوا، اور مولانا کی قیادت میں چلنے والی تحریک اسلامی نے تقسیم کے بعد ہند میں ملت اسلامیہ کے اکھڑتے ہوئے قدم روک دیئے اور وہ بلا مبالغہ آزاد ہندوستان میں ملت کی مسیحا بن کر ابھری، لیکن ذاتی حیثیت میں بہر حال مولانا کا یہ نقصان تھا، جسے انہوں نے ملک و ملت کی خاطر اور فی سبیل اللہ پورے شرح صدر کے ساتھ اٹھانا گوارہ کیا۔ علاوہ آپکی تمام تر افتاد طبع علمی اور تحقیقی تھی۔ دوسرے دور امارت کے آخری سالوں تک میں راقم نے عربی کے علاوہ انگریزی کی بعض ضخیم کتابیں مطالعہ کرتے دیکھیں۔ اسی زمانے میں ایک موقع پر آپ کے اس تاثر سے بھی آپکی اسی افتاد طبع کا اندازہ ہوتا ہے کہ اگرچہ امارت کی ذمہ داریاں سر آجانے کی وجہ سے تعلیم و تدریس کی خدمت سے میرا تعلق برقرار نہ رہ سکا لیکن فکری طور پر مجھے یہ شغل ہمیشہ دوسرے تمام کاموں سے زیادہ عزیز اور محبوب رہا ہے۔ ۱؎

تحریک اسلامی کی قیادت

۱۹۴۷ء میں ملک کی تقسیم کے ساتھ تحریک اسلامی بھی دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ ایک سال بعد جب ہندوستان میں تحریک کی تنظیم نو عمل میں آئی تو مولانا متفقہ طور پر، اور معتبر روایات کے مطابق بانی جماعتؒ کے واضح اشارہ پر، اسکے پہلے امیر منتخب ہوئے۔ اس کے بعد ۱۹۷۲ء تک مسلسل پچیس سال یعنی چوتھائی صدی عرصہ تک اس منصب جلیل کیلئے مولانا ہی کا انتخاب عمل میں آتا رہا۔ ۱۹۴۷ء میں تقسیم کے نتیجے میں ملک میں جو حالات رونما ہوئے اس کی خاص زد مسلمانوں پر تھی۔ جس نے ہندوستان میں ملت اسلامیہ کی چولیں ہلا کر رکھ دیں۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد یہ انکے لئے سب سے بڑا صدمہ تھا۔ بلکہ بعض پہلوؤں سے اس کی ہولناکی اس سے بھی زیادہ بڑھی ہوئی تھی۔ ان حالات میں جبکہ مسلمانوں کے جینے کے لالے پڑے ہوئے تھے

۱؎ اگست ۱۹۷۲ء میں لندن کے تبلیغی دورے اور سفر حج سے واپسی پر ۲۰ ستمبر ۱۹۷۲ء کو طلبہ مدرسۃ الاصلاح سے ملاقات میں اظہار خیال۔ بحوالہ سالانہ مجلہ انجمن مدرسۃ الاصلاح، شمارہ ۱۹۷۲ء–۱۹۷۳ء، صفحہ ۳۰

اور وہ ہر چہار طرف سے یورش اور حملوں کی زد میں تھے، ہندوستان میں حکومت الٰہیہ اور غلبہ نظام اسلامی کی بات کرنا اپنے ساتھ جو مسائل اور ناہمواریاں رکھتا تھا، اس کا اندازہ آسانی کے ساتھ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن مولانا کے جوش و عزم کے ساتھ حکمت و تدبر سے بھری قیادت ان دشواریوں کو عبور کرنے میں پوری طرح کامیاب رہی اور یہ اسی کا نتیجہ ہے جو آج ہندوستان کی سنگلاخ سرزمین میں تحریک اسلامی کا یہ شجرۂ طیبہ اصلہا ثابت و فرعہا فی السماء کا منظر پیش کر رہا ہے اور مختلف حیثیتوں سے ان خصوصیات و امتیازات کا حامل ہے جن کی عالمی تحریکات اسلامی کے اکثر بیشتر حلقوں میں کمی کی محسوس ہوتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ظاہری اسباب میں تحریک اسلامی کو اس کے موجودہ مقام تک پہونچانے اور اسے کامیابیوں سے ہمکنار کرنے میں مولانا محترم کی بے مثالی شخصیت کے بہ پہلو بڑا دخل آپ کے رفقاء کار کا رہا جن کی پوری ٹیم بے لوثی و اخلاص کا پیکر اور ایثار و قربانی کا اعلیٰ ترین نمونہ تھی۔ جو اس تحریک میں اپنے دنیوی مستقبل کو داؤں پر لگا کر بلکہ صحیح تر لفظوں میں ہر طرف سے یکسو ہو کر اپنی کشتیاں جلا کر آئے تھے۔ لیکن ادارہ کے سربراہ کی حیثیت سے آخری طور پر اس کا سہرا مولانا محترم کے سر ہی جاتا ہے۔ اگر یہ صحیح ہے کہ ہندوستان میں دار المصنفین اور پاکستان میں تحریک اسلامی کو قائم کرنے اور چلانے کا کارنامہ علامہ سید سلیمان ندوی اور مفکر اسلام مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے ہاتھوں انجام پایا تو ہندوستان میں تحریک اسلامی کا قیام و استحکام مولانا ابواللیث اصلاحی ندویؒ کی بے مثالی کارکردگی کا مظہر ہے

جیسا کہ اشارہ کیا گیا ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی تقسیم کے بعد مولانا اصلاحی ندوی نے تحریک اسلامی کی قیادت سنبھالی تو ملک کے حالات انتہائی ناگفتہ اور دگرگوں تھے۔ اور ملت اسلامیہ مختلف سمتوں سے چند در چند یورشوں اور حملوں کی زد میں تھی۔ اسکے جرائم کے کھاتے میں علاوہ اس ہزار سالہ ہندو مسلم کشمکش اور منافرت کے جسے اپنے تقریباً دو سو سالہ دور اقتدار میں انگریز نے خوب بڑھا کر پیش کیا تھا اور دونوں قوموں کے درمیان ایک ناقابل عبور خلیج پیدا کرنے میں کامیاب رہا تھا، اس سے ہٹ کر اس وقت مسلمان قوم ملک کی تقسیم کی مجرم تھی۔ جبکہ طرفہ ستم یہ تھا اس تحریک میں پیش پیش شمالی ہند کی ملت اسلامیہ تھی جو مملکت خداداد

کے قیام کے بعد وہاں جا چکی تھی، اپنے قدیم وطن میں رہ جانے اور آئندہ کیلئے جس کی قسمت اور موت و زیست بھارت ہی سے وابستہ تھی۔ مسلمان قیادت کا عنصر جو تقسیم ملک کا مخالف اور آزادی کے بعد متحدہ جماعت کا حلیف اور ہمنوا تھا وہ مسلمان اقلیت پر اکثریت کے عتاب کو زبانی قیل و قال سے عملی قیل و قال سے بڑی حد تک حق بجانب اور روا سمجھتا تھا۔ ان حالات کا نتیجہ تھا کہ آزادی کے بعد ملت اسلامیہ ہند سخت بے یقینی بلکہ مایوسی کا شکار، زندگی کی امنگ سے عاری اور جائے ماندن نہ پائے رفتن کی حالت کی آئینہ دار تھی، اور ایسا لگتا تھا کہ اب جو اس کے قدم اکھڑے ہیں تو شاید آئندہ کبھی جمنے کا نام نہ لیں گے۔

مایوسی اور انتشار کے اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں مولانا ابواللیث اصلاحی ندویؒ صبح مسعود میں خورشید بن کر نکلے اور ملت کے زخموں کے مداوا، اسکی چارہ جوئی اور شیرازہ بندی کیلئے مردے از غیب بروں آید الخ کا مصداق ثابت ہوئے۔ تحریک اسلامی کے سرکاری ترجمان ماہنامہ زندگی رامپور کے صفحات سے آپ نے غیرت ملی کو للکارا اور بے یقینی اور مایوسی کے گرداب سے نکل کر ہندوستان میں خیر امت کی حیثیت سے اپنے کو پہچاننے اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے فریضہ منصبی کو ادا کرنے کا آوازہ بلند کیا۔ ہندو احیاء پرستوں کے علاوہ بہت سے نام نہاد سیکولر ہندو لیڈر اور دانشور بھی اسلام اور مسلمانوں کو نشانہ بناتے ہوئے میدان میں نکل آئے تھے۔ مولانا اصلاحی ندوی نے زندگی کے اداریے کالم میں ان سب کے خلاف پورا محاذ کھول دیا، اور مسلمان امت پر فرقہ پرستی اور علٰحدگی پسندگی وغیرہ بے بنیاد الزامات و اتہامات کا پردہ چاک کرتے ہوئے آپ نے بے لاگ انداز میں قرآن و سنت کے قاطع دلائل کی روشنی میں اسلام اور ملت اسلامیہ کی اصولی اور واقعی پوزیشن کو واضح کیا۔ مسلمانوں میں بہت سے لوگ الکشن اور معاہداتی سیاست اور ہند میں اپنے بعض حقوق کے ساتھ زندہ رہ پانے کو ملت اسلامیہ کا کل منتہائے مقصود باور کرتے تھے، مولانا نے اس طرح کے لوگوں کی غلط فہمیوں کا پردہ چاک کرنے میں بھی کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ مولانا کے یہ بے باک اور جرأت مندانہ مضامین و مقالات بعد میں مسئلہ انتخابات اور مسلمانان ہند، اور مسلمانان ہند کا آئندہ لائحہ عمل وغیرہ مجموعوں میں شائع ہوئے جو آج بھی

اندر ویسی ہی تازگی اور حیات آفرینی کے حامل ہیں جن کے ذریعہ ملت اسلامیہ اپنے واقعی مقصد زندگی کا صحیح شعور حاصل کرسکتی ہے۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کے اندر سے ملک ہند علماء کا ایک طبقہ اول دن سے تحریک اسلامی کی مخالفت میں سرگرم تھا۔ آئے دن نت نئے اتہامات کی بوچھاڑ کرتا رہتا تھا۔ ملک کی تقسیم کے بعد یہاں کی تحریک اسلامی اسکے حملوں کا نشانہ بنی اور وہ اسے طرح طرح کے الزامات سے نوازنے لگے۔ مولانا اصلاحی ندوی نے اپنے سنجیدہ اور متین قلم سے اس طبقہ کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کا پورے زور دقوت سے مقابلہ کیا۔ یہاں تک کہ آپ نے دلائل کے میدان میں انہیں لاجواب کرکے رکھ دیا۔ مولانا سید حسین احمد مدنی سے مولانا اصلاحی ندوی کی طویل مراسلت اسی سلسلے کی ایک نمایاں چیز ہے جس میں مولانا کے موقف کی مضبوطی اور مزاج اور طبیعت کی بلندی کو کوئی بھی غیر جانبدار شخص بادنیٰ نظر محسوس کرسکتا ہے۔ پاکستان میں انتخابات کے مسئلہ پر جماعت کے متعدد سینئر رہنماؤں کی اجتماعی علٰحدگی کے پس منظر میں ہندوستانی جماعت پر مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہ کے اٹھائے گئے اعتراضات کا جو جواب مولانا نے زندگی رامپور میں لکھا وہ بھی مولانا ندوی کی ایک شاہکار تحریر ہے۔ جوابی متانت سنجیدگی، زور بیان اور قوت استدلال میں اپنی مثال آپ ہے۔

تحریک کے کام کے پھیلاؤ کے ساتھ مولانا کی تنظیمی مصروفیات روز بروز بڑھتی رہیں۔ ہندوستان میں تحریک اسلامی کا غلبہ دین، کا نصب العین مسلمان امت کو ایک متعین نشانہ فراہم کرچکا تھا۔ جس کی فکری بنیادیں تحریک کا طاقتور لٹریچر پہلے ہی فراہم کرچکا تھا اور تحریک کے علمی شعبے کی طرف سے اس میں روز بروز نیا اضافہ بھی ہورہا تھا۔ اس کے علاوہ وقت کے گزرنے کے ساتھ حالات کا دباؤ بھی دن بدن کم ہوتا جاتا تھا۔ اس کا نتیجہ تھا کہ اب مولانا اصلاحی ندوی صفحہ قرطاس پر کم اور میدان عمل میں زیادہ نظر آنے لگے، اور آپکی تمام تر توجہ تحریک کے تنظیمی مسائل، اسکے کام کی توسیع اور اس سے متعلق امور و معاملات پر مرکوز ہوگئی کل ہند سطح پر تحریک کی تنظیم نو، اس کے مختلف سطح کے اجتماعات میں شرکت ارکان جماعت کی نگرانی و تربیت، ملی مسائل اور قومی و ملکی مسائل کے سلسلے میں دلچسپی، انکے سلسلے میں

یا انکے اظہار خیال اور عملی سرگرمیاں، مولانا اصلاحی کی یہ ایسی متنوع اور ہمہ جہت مصروفیات تھیں جو آپ کی پوری توجہ اور قوت کار کو اس کیلئے فارغ کردینے کی متقاضی تھیں چنانچہ اب مولانا ہمیں لکھنے پڑھنے کی نسبت سے زیادہ تر مختلف سطح پر تقریروں، اخباری بیانات اور انٹرویوں سے ملتے نظر آتے ہیں۔ تحریک کا مقصد، پالیسی پروگرام اور طریقۂ کار کی وضاحت وہ بنیادی اور مرکزی موضوع ہے، جس کے لئے آپکو مختلف مواقع اور مختلف سطحوں پر پوری یکسوئی اور تیاری کے ساتھ سامنے آنا پڑتا ہے۔ کل ہند اجتماعات میں آپ کے خطبۂ صدارت استفادہ کی خاص چیز ہوتے ہیں جنمیں آپ دین، دعوت دین اور تحریک اسلامی کے سلسلے میں کھل کر اور نسبۃً تفصیل کے ساتھ اظہار خیال کرتے ہیں۔ بھارت کی نئی تعمیر اور ہم جماعت اسلامی پالیسی پروگرام اور طریقۂ کار وغیرہ اسی سلسلے کی اہم ترین کڑیاں ہیں۔ قومی اور ملکی مسائل کے سلسلے میں سیکولرزم، جمہوریت، فرقہ واریت اور قومی یکجہتی وغیرہ کے موضوعات پر آپکے اظہار خیالات مختلف صورتوں میں سامنے آئے جنہوں نے ملت اسلامیہ ہند کو ان مسائل کے سلسلے میں سوچنے کا نیا انداز عطا کیا۔ اور آزاد ہندوستان میں پہلی بار ان اصطلاحات کے چکر میں الحاد و لادینیت کے فتنے سے بچ کر امت کو مسلمان کی حیثیت سے زندہ رہنے اور اس ملک میں اپنا مطلوبہ کردار ادا کرنے کا شعور حاصل ہوا۔ مولانا اپنی انہی گوناگوں صلاحیتوں کے ساتھ چوتھائی صدی عرصہ تک ۱۹۴۸ء تا ۱۹۷۲ء تحریک اسلامی کی قیادت کرتے رہے۔ اپنے رفقاء کار کے ساتھ آپ کے بے پایاں اخلاص و بے لوثی کی بدولت خدا کے فضل سے تحریک کو دن دونی رات چوگنی ترقی نصیب ہوئی۔ اور آج اپنی عمر کی تقریباً چالیسویں منزل طے کرتے ہوئے تحریک اسلامی ہند مسلمانان ہند کی فعال نمائندہ کی حیثیت سے اپنا لوہا منوا چکی ہے

امارت سے سبکدوشی

۱۹۷۲ء کا زمانہ آیا اور مولانا امارت کی گراں بار ذمہ داری سے سبکدوش ہوگئے۔ دین و ملت کی پچیس سالہ سرگرم خدمت کے بعد مولانا کی زندگی کا یہ دوسرا دور تھا جس میں آپ نے خاموشی اور گوشہ گیری کو اپنا وظیفہ قرار دیا۔ مولانا کے متحرک اور سرگرم سابقہ دور کی طرح یہ دور سکوت بھی اپنے اندر اتنی تابانیاں اور عبرت و نصیحت کے ایسے پہلو

دیکھنا پڑے گا۔ ان سطور کے لکھنے والے کو بار بار خیال ہوتا ہے کہ روز حشر خداوند عالم کی بارگاہ میں ربع صدی کی جد وجہد اور بے مثال دوڑ دھوپ کے مقابلہ میں بظاہر یہ خاموش اور غیر سرگرم مدت ہی بازی نہ لے جائے۔ مولانا نے اپنے اس عہد خود کشی میں بے نفسی اور ایثار و قربانی کی ایسی کڑی مثال قائم کی ہے کہ اس کے تصور سے آدمی کو پسینہ آنے لگتا ہے۔

مولانا اپنی پچیس سالہ سرگرم خدمت کے بعد دہلی چھوڑ کر آبائی وطن بالکل خالی ہاتھ اور مسائل کا انبار لیے پہنچے۔ معلوم ہوا کہ مولانا نے تحریک کے دوسرے سرفروشوں کی طرح آخر وقت تک انتہائی معمولی مشاہرہ پر کام کیا تھا۔ بونس اور فنڈ وغیرہ نام کی اس وقت تک جماعت میں کوئی چیز نہ تھی۔ سچ ہے کہ تحریک کے اکثر و بیشتر ہمہ وقتی کارکنان اگر فقراء و مساکین تھے تو مولانا راس الفقراء اور راس المساکین تھے۔ پھر مشیت کا فیصلہ کہ مولانا کے تنہا صاحبزادے اس وقت مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں زیر تعلیم تھے۔ باقی تمام لڑکیاں جن میں بیشتر کی شادیاں نہیں ہوئی تھیں مولانا نے اپنی پوری زندگی معاشی مستقبل سے آنکھیں بند کرکے گزاری تھی۔ وطن واپسی پر چھوٹی سی زراعت جس کی بافت گھر سے طویل غیر حاضری کے سبب یقیناً متاثر ہوگی اور معمولی کاشت کاری کی بافت ہی کیا ہو مولانا کا کل ذریعہ آمدنی قرار پائی۔ گھر کے گوناگوں اور غیر معمولی مسائل مولانا موصوف نے اس انتہائی ناقابل لحاظ آمد سے کس طرح حل کئے، چھوٹی ملازمت کے کسی آدمی کیلئے جو اکثر و بیشتر مہینہ کا مشاہرہ بھی پیشگی لے لیا کرتا ہے، اس کے تصور سے اسکا ذہن تھکنے لگتا ہے۔ اس دورِ عزلت نشینی میں مضمون نگار کو مولانا سے شرف نیاز حاصل کرنے کا موقعہ مل سکا لیکن انکے گھر کی شان، دنیا سے بے نیاز زندگی سے متعلق جسکو منا طیب اللسان پایا۔ دو چار ہاتھوں کا چھپر کچا کمرہ جسمیں مولانا خود ہی جھاڑو دے لیتے۔ جس گھر کا یہ نقشہ ہو اس کے اثاثہ کا اندازہ بھی آسانی کیا جا سکتا ہے۔ ہم نے جماعت کے بہت سے مخالفین کو رشک بھرے انداز میں بار بار کہتے سنا کہ اگر کسی کو صحابہؓ کی زندگی کا نقشہ دیکھنا ہو تو اسکی ایک جھلک جانا چاہے تو اس گوشہ میں جا کر دیکھ لے۔ اگر امت دنیا میں شہداء اللہ فی الارض کے مقام پر فائز ہے، جیسا کہ حدیث رسول میں اسے اس پر فائز بتایا گیا ہے، تو مولانا کے حق میں امت کے افراد کی گواہی بھی عند اللہ ان شاء اللہ ضرور سنی جائے گی۔

یہ تو تھا مولانا کے گھر کا ایک نقشہ جسکی عطر بیزیاں مشام جاں کو دور دور ہی سے متاثر کرتی

تھیں۔ ایسے تو ہم نے اپنی آنکھوں سے علی گڑھ میں دیکھا کہ مولانا کی واحد نرینہ اولاد اس عہد میں بھی اعلیٰ تعلیم مکمل نہیں کر سکی۔ اور اسے تعلیم ادھوری چھوڑنے کے ساتھ تلاش روزگار میں لگ جانا پڑا۔ مولانا کی اس عظیم قربانی کو بیسویں صدی کی نسبت سے معجزہ ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ تحریک کے دوسرے بہت بے لوث خادموں کو بھی اس طرح اور بسا اوقات اس سے بھی سخت حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ اور بہت سے وہ لوگ بھی رہے جو اپنے پورے خاندان کو مسائل کے نرغے میں چھوڑ کر مولیٰ کے حضور جا پہنچے۔ لیکن بہرحال ادارہ کے سربراہ کی طرف نگاہیں سب سے پہلے اٹھتی ہیں، اور اسے غیر فطری بھی قرار نہیں دیا جا سکتا۔

امارت سے سبکدوشی کے بعد مولانا کیلئے جماعت میں کوئی دوسرا منصب قابل قبول نہ ہو سکا۔ حالانکہ تحریک کی طرف سے بجا طور پر آپ کو اسکی پیشکش کی گئی تھی۔ امارت کے تسلسل کے مسئلہ کی طرف مولانا اس سے پہلے بھی جماعت کو برابر متوجہ کرتے رہے تھے کہ نئے افراد کو کام کا موقعہ دیا جائے تاکہ نئے تجربات کئے جا سکیں۔ سلسلہ میں اس امکان کو عملی شکل دینے کے لئے آپ نے اپنے تئیں امارت سے سبکدوشی کا سخت فیصلہ کیا۔ اس صورت میں جماعت میں کوئی منصب ۔ جو غالباً مرکزی اور کوئی اہم منصب ہی ہو سکتا تھا، قبول کرنے کا مطلب تھا کہ نئی کابینہ حسب دلخواہ کام کرنے میں کسی نہ کسی درجہ میں حجاب کا شکار رہے۔ مولانا پورے پچیس سال تک، دوسرے لفظوں میں آزاد ہندوستان میں جماعت کی اب تک کی پوری زندگی میں اسکے اعلیٰ ترین ذمہ دار، اور اسکے تمام اہم فیصلوں میں بلا واسطہ اور براہ راست اثر انداز تھے۔ اس صورت میں نئی کابینہ میں آپکی سرگرم شمولیت کا مطلب تھا کہ اسکے فیصلوں میں آپکے وزن کو بہرحال محسوس کیا جائے، جبکہ جماعت کے درجن بہت سے مخلصین کی طرح مولانا کی خواہش تھی کہ نیا تجربہ کسی حجاب کے بغیر ہو اور نئی کابینہ معمولی طور پر بھی متاثر ہوئے بغیر فیصلے کرنے اور انہیں عملی جامہ پہنانے میں آزاد ہو۔ اس سلسلے میں دوسرا نقطۂ نظر بھی ہو سکتا ہے کہ آدمی نئے انتظام کے ساتھ سرگرم تعاون کرنے کے باوجود بھی اجتماعیت کے مطلوبہ مصالح کو حاصل کر سکتا ہے۔ جیسا کہ جمہوری ملکوں اور اکثر و بیشتر جمہوری اداروں میں ہوتا ہے۔ لیکن افتاد طبع اور سوچ کا انداز ہر شخص کا الگ ہوتا ہے اور اجتماعیت کی ضرورت اور اسکے مصالح کا پورا لحاظ کرنے کے باوجود امزجہ و طبائع کے اختلاف کا لحاظ

بھی بہر حال کیا جانا چاہئے۔ مومن کے ساتھ یوں بھی حسن ظن اور نیک گمان روا ہے۔ پھر ایک شخص جو چوتھائی صدی کے عرصہ تک اجتماعیت کا سربراہ رہا ہو اسکی نسبت سے تو یہ چیز اور بھی ضروری ہے۔ ورنہ ادارہ کے سربراہ اور اسکے اعلیٰ ترین ذمہ دار کا خلوص و بے لوثی بھی اگر محل نظر بن جائے تو کوئی بھی اجتماعیت اپنی صالحیت کی کیا ضمانت فراہم کر سکتی ہے۔ جب افراد ایثار و قربانی کے پیکر اپنے قائد اول کے سلسلے میں شکوک و شبہات کا شکار ہو جائیں تو دوسروں کا کیا ذکر اور پھر اجتماعیت کے حریم کی عصمت کی کیا ضمانت باقی رہتی ہے۔ اعتراف کیا جانا چاہئے کہ مولانا کی یہ دو سالہ عزلت نشینی اور گوشہ گیری تحریک سے بددلی اور کسی ذاتی انقباض کا مظہر نہیں بلکہ سراپا بے لوثی و اخلاص کی آئینہ دار تھی جسے آپ نے اپنے اوپر مسائل کا انبار لاد کر جماعت کے مفاد اور اسکے مصالح کے تحت گوارہ کیا۔ ایک شخص ایک ادارہ کا بانی اور اسکا سربراہ اول منتخب ہو، چوتھائی صدی کی انتھک جد و جہد کے بعد اسے اپنے پیروں پر کھڑا کرے اور پھر دس بارہ برس کے طویل عرصہ تک سود و زیاں سے عاری ہو کر اپنے کو اس سے بالکل الگ تھلگ کرے۔ سینے پر ہاتھ رکھ کر سوچنا چاہئے کہ تحریک میں کتنے افراد اسکی ہمت کر سکتے ہیں۔ خود کو محروم کر کے دوسروں کو فیضیاب کرنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔ اس کیلئے بڑی عالی ہمتی کشادہ ظرفی اور بلند نگاہی کی ضرورت ہے

مولانا کے حالات کا تقاضا تھا کہ جماعت میں نہیں، کسی اور ادارے سے وابستگی اختیار کر لیتے اور اس طرح اپنے سخت ترین مسائل کے حل کا سامان کرتے۔ لیکن تحریک و جماعت کے وسیع مفاد کی خاطر اس طرح کی بہت سی پیشکشیں اور امکانات بھی آپ کے لئے قابل توجہ نہ بن سکے ایک شخص جس نے اپنی شعوری زندگی کا طویل ترین عرصہ ایک ادارہ سے وابستہ ہو کر گزار دیا اور اس کا نام اس ادارہ کا ایسا جزو لاینفک بن گیا کہ اسکے بغیر نہ صرف یہ کہ اسکی تصویر مکمل نہیں ہوتی بلکہ اسکا تصور بھی محال ہے، آخری عمر میں ایسی کسی شخصیت کا کسی دوسرے ادارہ سے وابستہ ہونا جو امکانی طور پر تحریک و جماعت سے بیزار اور اسکے مخالف بھی ہو سکتا تھا بہر حال ایک ایسی چیز ہوتی جسے خاص طور پر مخالف حلقوں میں محسوس کیا جاتا بلکہ بسا اوقات اسے اچھالا اور حاشیہ آرائیوں کا موضوع بنایا جا سکتا تھا۔ تحریک و جماعت کے حق میں یہ چیز خواہی نخواہی شکوک و شبہات پیدا کرنے کے ساتھ اس کے وقار اور ساکھ کو بھی کسی نہ کسی درجہ میں مجروح کئے بغیر نہ رہتی۔ مانا گیا کہ آپ سے بہت سے حلقے مولانا کو

خوشی خوشی دینے کیلئے تیار بلکہ اس کیلئے بضد اور درپے اصرار تھے۔ لیکن مولانا کی اصلاحی کی عظیم المرتبت شخصیت نے اسطرح کی تمام پیش کشوں کو ناقابل التفات قرار دیکر تحریک و جماعت کے تئیں اس طرح کے کسی امکانی فتنے کو کھلنے کا موقع ہی نہ دیا۔ ذاتی حیثیت میں آپ نے اپنا ہر طرح کا نقصان گوارہ کیا لیکن اپنے بس بھر تحریک کیلئے کوئی آزمائش پیدا ہونے کی گنجائش نہیں رہنے دی

دس بارہ سال کی مدت بہت لمبی ہوتی ہے۔ سرکاری ملازمتوں کا ذکر ہی کیا جہاں فنڈ اور محفوظ پنشن وغیرہ کی سہولیات کے باوجود ریٹائرمنٹ سے پہلے کا ہے آدمی عجیب بدحواسی کا شکار اور آئندہ کے امکانات کیلئے سرگرداں اور مزید آمدنی کی تلاش میں کیا کچھ کوششیں نہیں کرتا ہے۔ پرائیوٹ اور قومی و مذہبی ملازمتوں میں بھی آدمی اگر سال چھ مہینے "بیکاری" کے گزار دے تو اسے بڑا کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔ لیکن مولانا جن کی پوری زندگی دنیوی اعتبار سے بظاہر ایک چھوٹی ملازمت بسر ہوئی، آپنے کسی معروف سہولت کے بغیر آخری عمر کی اپنی مسائل سے بھرپور زندگی کے پورے دس بارہ سال اسی "بیکاری" میں گزار دئے۔ ایثار و قربانی کی آپ نے یہ ایسی کڑی مثال قائم کی ہے جو دین و ملت کے بہت سے مخلص خادموں کو بھی تھکا دینے والی اور اسکی تقلید تو اپنی جگہ اسکے تصور سے بھی گھبراہٹ اور پریشانی محسوس ہوتی ہے۔

مولانا کے اس دور عزلت نشینی کا دوسرا پہلو بھی اپنے اندر عبرت و نصیحت کا بڑا سامان رکھتا ہے۔ موصوف نے امارت کا پورا دور چھوٹی موٹی اور معمولی سی شہری سہولیات کے ساتھ گزارا، اور ایک انجمن کے ساتھ ہمیشہ بلکہ بلا انقطاع اسکے صدر نشین رہے۔ علی گڑھ کی حد تک بھی ہمیں معلوم ہے کہ صاحبوں کا خاندان "دیہات" میں گرمی کی چھٹیاں بھی بمشکل گزار پاتا ہے جبکہ خاص ماحول سے وابستہ سہولیات کے علاوہ بقیہ دیگر تمام آسانیاں اسے حاصل ہوتی ہیں۔ لیکن مولانا پورے پچیس سال رامپور اور دہلی میں گزارنے اور تحریک کے سربراہ اول کی حیثیت سے بعض ناگزیر مخصوص سہولیات کے ساتھ رہنے کے باوجود آبائی وطن میں اسی دیہات کی زندگی کے لئے رخت سفر باندھ کر ایسا کر لیتے ہیں گویا مہینے کہ کوئی بات ہی نہ ہو جبکہ تیس چالیس کے برائے نام تعلق کے بعد اس گھر کا نقشہ بھی جیسا کچھ ہو گا ظاہر ہے۔ عام طور پر آدمی کیلئے اس سے بھی بڑا مسئلہ

بقیہ ص ۹ پر

سلطان ٹیپو کے نام نپولین کا خط

یہ مکتوب منزل تک پہنچ جاتا تو برصغیر کا نقشہ کچھ اور ہوتا

پروفیسر ریاض حسین (قاہرہ)

[جولائی ۱۷۹۸ء میں سرزمین مصر پر اترنے کے بعد نپولین بوناپارٹ نے قاہرہ سے سلطان ٹیپو کو خط لکھا۔ اس خط کا مکمل متن ایک دو پرانی اور اب نایاب کتب کے سوا سلطان ٹیپو یا نپولین کی مستند انگریزی، فرانسیسی اور اردو سوانح عمریوں میں عام نہیں ملتا تاہم انڈیا آفس لائبریری لندن کے ریکارڈ سے حاصل شدہ متن کا اردو ترجمہ پہلی بار پیش کیا جا رہا ہے۔ اس سے قبل اردو کی کسی کتاب یا رسالے میں نپولین کا خط بنام ٹیپو شائع نہیں ہوا۔]

آزادی فرانس

آزادی — مساوات

ہیڈکوارٹر قاہرہ (7th Pulvoise) جمہوریہ فرانس اکائی اور ناقابل تقسیم کا سال ہفتم منجانب بوناپارٹ ممبر قومی کونشن، جنرل انچیف بجانب سلطان معظم ہمارے عظیم دوست ٹیپو صاحب!

آپ کو اس سے پہلے اطلاع مل چکی ہے کہ میں بے شمار اور ناقابل شکست افواج لے کر جو آپ کو انگلستان کے فولادی شکنجے سے آزاد کرانے کے جذبے سے سرشار ہیں، بحیرہ احمر کے ساحلوں تک آن پہنچا ہوں۔ میں بڑے شوق سے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میری خواہش ہے کہ براستہ مسقط اور مخا (Mocha یمن کی بندرگاہ) آپ مجھے اپنے سیاسی حالات سے مطلع کریں بلکہ میری خواہش یہ بھی ہے کہ کسی سمجھدار آدمی کو جو آپ کا معتمد ہو سویز یا قاہرہ روانہ کریں تاکہ میں اس سے مشورہ کر سکوں۔ خدائے عظیم آپ کے دشمنوں کو نیست و نابود کر دے۔

(دستخط)
بوناپارٹ

اسی خط کے ساتھ ہی نپولین نے شریف مکہ کو بھی ایک خط لکھا جس میں اسے مصر کی مکمل سیاسی اور معاشی صورت حال سے مطلع کیا اور گزارش کی کہ مندرجہ بالا خط ہمارے دوست ٹیپو سلطان کو روانہ کر دیا جائے۔ شریف مکہ کے نام خط کے متن کا اردو ترجمہ درج ذیل ہے۔

آزادی فرانس

آزادی — مساوات

منجانب بوناپارٹ ممبر نیشنل کونشن جنرل انچیف بجانب شریف مکہ۔

جہاز کے ناخدا سے آپ کو پوری معلومات مل جائیں گی کہ قاہرہ، سویز اور ان کے درمیانی علاقے میں ہر طرح پورا سکون ہے اور تمام آبادی پورے اطمینان سے رہ رہی ہے۔ اب ملک میں ایک بھی مملوک ظالم کا وجود نہیں۔ یہاں کے باشندے بلاخوف و خطر اور بلا جھجک کاشتکاری اور دوسرے کام کاج میں حسب سابق مصروف ہیں اور بالفضل خدا ان کاموں میں روز افزوں ترقی ہوگی۔ اور مال تجارت پر محصولات اور ٹیکس کم کر دیئے جائیں گے۔ سامان تجارت پر محصولات اب اسی سطح پر آگئے ہیں جس سطح پر مملوکوں کی طرف سے عائد کردہ اضافے سے پہلے تھے۔ تاجروں کو ہر طرح کی سہولت اور مدد فراہم کر دی گئی ہے۔ قاہرہ اور سویز کے درمیان سڑک سفر کیلئے کھلی اور محفوظ ہے، اس لئے آپ اپنے ملک کے تاجروں کو یقین دلائیے کہ وہ اپنا مال سویز لائیں اور بلا خوف و تردد فروخت کریں۔ اس کے بدلے میں یہاں سے جو سامان وہ خریدنا چاہیں خرید سکتے ہیں۔

اب میں آپ کو ایک خط ہمارے دوست ٹیپو سلطان کے نام بھیج رہا ہوں۔ اسے ان کی سلطنت میں ارسال کر کے مجھے ممنون فرمائیں۔

دستخط
بوناپارٹ

شریف مکہ سیاسی اور مالی امداد کے عوض انگریزوں سے ملا ہوا تھا۔ اس نے نپولین کا خط بنام ٹیپو برٹش ایجنٹ کیپٹن ولسن کے حوالے کر دیا۔ دراصل نپولین کے مصر میں وارد ہونے پر انگریزوں نے مشرق وسطیٰ میں جاسوسی کا ایک وسیع جال پھیلا دیا تھا اس کے ساتھ ہی

انھوں نے بھاری وظیفوں کے عوض عرب شیوخ، سرداروں اور حکمرانوں کی ہمدردیاں حاصل کر لیں تاکہ ٹیپو اور نپولین کے درمیان نامہ و پیام انگریزوں کے ہاتھ لگتا رہے۔ اس طرح خطوط اور پیغامات راستے ہی میں پکڑ لئے جانے کی بنا پر منزل مقصود تک نہیں پہنچ پاتے تھے۔

گو سلسلہ مواصلات منقطع تھا پھر بھی نپولین مشرق اوسط کے راستے ہندوستان وارد ہونے کے لئے پختہ عزم کئے بیٹھا تھا۔ اس وقت بحیرہ ایڈریاٹک سے بحیرہ عرب تک سیاسی اور مذہبی اثر و رسوخ رکھنے والی ایک ہی اسلامی طاقت تھی اور وہ تھی سلطنت عثمانیہ۔ فرانس اور اس کے ایشیائی اتحادیوں کے درمیان پیغام رسانی کا سلسلہ کامیابی سے توڑنے کے بعد انگریزوں نے عثمانی خلیفہ سلطان سلیم کی حمایت حاصل کرنے کی طرف پوری توجہ مبذول کر دی۔ عثمانی خلیفہ نے بھی اپنا مفاد اسی میں دیکھا کہ فرانسیسیوں کے خلاف انگریزوں کی مدد کی جائے۔ چنانچہ قسطنطنیہ سے سلطان سلیم نے ٹیپو کے نام ایک طویل مراسلے میں ترکی کے خلاف فرانسیسیوں کے جرائم کی لمبی فہرست تحریر کی اور اس امر پر خصوصی زور دیا کہ فرانسیسی اسلام کے بدترین دشمن اور انگریز بہترین دوست ہیں۔

سلطان ترکی نے یہ بھی شکایت کی کہ نپولین کی مصر میں آمد بین الاقوامی قانون کی صریح خلاف ورزی اور علاقے کے سرداروں کے مفاد اور سب سے بڑھ کر اسلام کے خلاف بدترین اقدام ہے کیونکہ صوبہ مصر، مکہ مکرمہ مسلمانوں کے قبلہ اور مدینہ منورہ سے قربت کی بنا پر ہمارے لئے عزت و تکریم کا علاقہ ہے۔

سلطان سلیم نے لکھا کہ نپولین کا مقصد علاقے کے حکمرانوں کو معزول کرنا اور آزاد عوامی ریاستیں قائم کر کے امت مسلمہ کو تباہ و برباد کرنا ہے۔ فرانسیسیوں کا مزید پلان یہ ہے کہ سرزمین عرب کو چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں منقسم کر کے وہاں جمہوری حکومتیں قائم کر دی جائیں، مسلمان اقوام، مسلمان ممالک اور خود مذہب اسلام پر حملے کئے جائیں، اور اس طرح بتدریج روئے زمین سے مسلمانوں کا خاتمہ کر دیا جائے۔

ٹیپو سلطان اور نپولین کے مابین "پختہ اتحاد" کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ترکی کے

[illegible] نے ٹیپو کو [illegible] کیا:

"ہمیں معلوم ہوا ہے کہ بعض خفیہ سازشوں کے نتیجے میں جو فرانسیسی اپنی خصلت کے مطابق ہندوستان میں کرتے رہتے ہیں تاکہ انگریزوں کی پرامن بستیوں اور صوبوں میں تباہ کن فساد برپا ہوتا رہے، حضور والا اور فرانسیسیوں کے درمیان "پختہ اتحاد" قائم ہوئے اور فرانسیسی فوج کا ایک دستہ مصر کے راستے آپ کے پاس پہنچنے کی توقع ہے۔

ہمیں یقین کامل ہے کہ فرانسیسی پلان کا اصل ہدف آپ جیسے فہم و دانش رکھنے والے حکمران سے پوشیدہ نہیں رہ سکتا، اور یہ کہ آپ کی طرف سے فرانسیسیوں کی دغابازی کا کماحقہ سد باب کیا جائے۔

سلطان سلیم نے پوری سنجیدگی سے سلطان ٹیپو کو یقین دلایا کہ آزادی اور مساوات کے ڈھونگ کے پس پردہ فرانسیسی دوسری اقوام کو اپنا غلام بنانے کا گھناؤنا ارادہ رکھتے ہیں۔ خلیفہ نے لکھا:

"یہ کوئی راز نہیں کہ تمام فرقوں اور مذاہب کو ختم کرنے کے لئے فرانسیسیوں نے آزادی کے نام پر ایک نیا نظریہ ایجاد کیا ہے۔ خود فرانسیسی قوم منکر خدا اور دہریہ ہے۔

"اس بات میں قطعاً کوئی شک نہیں کہ سلطنت عثمانیہ کے خلاف انکی موجودہ کوششیں اور ان کے مذموم عزائم جن کے پیچھے مشرق کی دولت لوٹنے کی ہوس ہے، یہ ہیں کہ اسلامی سلطنت کو فتح کر کے اس پر قبضہ جمائیں (خدا سے دعا ہے کہ ان کے یہ عزائم کبھی پورے نہ ہوں) اور تمام مسلمان آبادی کو یہاں سے نکال باہر کریں۔ انگریزوں کو تنگ کرنے کے بہانے وہ اصل ہندوستان میں داخل ہونا چاہتے ہیں اور پھر وہ جو کچھ کرنا چاہتے ہیں وہ حقیقت میں ان کے دل میں ہے۔ ہر جگہ جہاں بھی انہیں قدم جمانے کا موقع ملا، انھوں نے وہاں یہی کچھ کیا ہے۔"

امت مسلمہ کا سربراہ ہونے کی حیثیت سے سلطان ترکی نے ٹیپو کو تاکید کی کہ اسے انگریزوں کے خلاف جو بھی شکایات ہیں ان کے ازالے کیلئے وہ اس سے رجوع

اس کے ساتھ ہی سلطان سلیم نے سخت الفاظ میں ٹیپو کو تنبیہ کی کہ "برطانیہ عظمیٰ کے خلاف کوئی کارروائی کرنے کے تمام ارادوں سے باز رہو۔" اپنا طویل مراسلہ ختم کرتے ہوئے عثمانی خلیفہ نے لکھا۔

یہ ہماری خاص درخواست ہے کہ حضور والا از راہِ کرم انگریزوں کے خلاف کسی کارروائی میں شامل ہونے سے باز رہیں گے۔ اور فرانسیسیوں کی کسی بات پر کان نہ دھریں گے۔ اگر آپ کو انگریزوں سے کسی مضمون کی شکایت ہے تو ہمیں مطلع فرمائیں اور یقین رکھیں کہ ہم اپنی طرف سے پوری کوشش کریں گے کہ افہام و تفہیم سے مسئلہ حل ہو جائے۔ ہماری خواہش ہے کہ آپ کے فرانسیسیوں کے ساتھ جس تعلق کا ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے آپ فرانسیسیوں کو چھوڑ کر ایسا ہی تعلق برطانیہ عظمیٰ سے جوڑ لیں گے۔

سلطان سلیم کی اس پالیسی کی وجہ سے شرق اوسط کے شیوخ اور عوام سب کے سب نپولین اور ٹیپو کے خلاف ہو گئے۔ انگریزوں نے جا بجا چوکیاں قائم کر دیں۔ اور جاسوسی کے جال بچھا دئے تاکہ نپولین کی فرانسیسی افواج کو ہندوستان کی طرف بڑھنے سے روکا جا سکے۔

نپولین اس ارادے سے مصر آیا تھا کہ یورپ کے جھگڑے مشرق میں چکائے اور برطانیہ کو اس کی مشرقی نوآبادیوں سے نکالے۔ سکندر اعظم یونانی کے جنگی منصوبے پر عمل کرتے ہوئے وہ شمال مغرب سے ہندوستان میں داخل ہونا چاہتا تھا۔ اور ٹیپو جنوب سے یلغار کرتا ہوا دہلی پہنچنا چاہتا تھا۔ ٹیپو اور نپولین کی ملاقات غالباً پانی پت کے تاریخی میدان میں ہونی تھی۔ یہاں سے بعد متحدہ افواج نے ہندوستان میں پھیلی ہوئی انگریزی فوج کی چھاؤنیوں کے خلاف کارروائی کر کے انگریزوں کا صفایا کرنا تھا لیکن اس عظیم منصوبے میں ایک کمزوری تھی۔ دونوں جرنیلوں کی بری افواج کی پشت پر بحری فوج کا وجود نہیں تھا۔

اگست ۱۷۹۸ء میں برطانوی امیر البحر نیلسن نے ابو قیر کے معرکے میں فرانسیسی بحری بیڑے کو تباہ کر دیا۔ اس کے بعد نپولین کی مصر میں موجودگی محض بے کار ہو کر رہ

گئی۔ نیلسن کے ہاتھوں شکست کھانے کے بعد فرانسیسی بحریہ اتنی معذور اور لاچار ہو چکی تھی کہ اس کے لیے کراچی، بمبئی یا مدراس کے ساحل پر اترنا ناممکن ہو گیا تھا۔

اندرون اور بیرون ملک سیاسی فضا انگریزوں کے حق میں تھی۔ اور تمام علاقائی اور ریاستی حکمران انگریزوں کے حامی اور باجگزار تھے۔

ادھر انگریزوں نے حیدرآباد دکن کے نظام، مرہٹوں اور میسور کے سرداروں، جاگیرداروں اور ہندو سرمایہ داروں سے گٹھ جوڑ کر کے ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ ٹیپو کی سلطنت کی سرحدیں ہی پار نہ کر سکا۔ انگریزوں، نظام اور مرہٹوں کی افواج نے فروری ۱۷۹۹ء میں سلطنت میسور کو گھیر لیا اور ۴ مئی ۱۷۹۹ء کی تپتی دوپہر سلطان فتح علی ٹیپو دشمن کے خلاف لڑتا ہوا شہید ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

دوسری طرف بحر ہند اب مکمل طور پر برطانوی بحریہ کے قبضے میں تھا۔ شرق اوسط کے حکمران، انگریزوں کے ساتھ تھے۔ اور عوام میں فرانسیسیوں کی مبینہ اسلام دشمنی کا چرچا اتنا عام تھا کہ نپولین اگر کسی طرح اپنی فوج لے کر ساحل عرب پر اتر بھی جاتا تو، ممکن ہے کہ آبادی کی مخالفت، خوراک اور پانی کی قلت، سڑکوں کی غیر موجودگی اور آب و ہوا کی ناموافقت کی وجہ سے اس کی ناقابل شکست افواج کا ایک سپاہی بھی زندہ سندھ تک پہنچ پاتا۔

(بشکریہ اردو ڈائجسٹ لاہور پاکستان)

بقیہ: لیل و نہار

کی والدہ محترمہ ایک عرصہ سے علیل تھیں۔ ۔ ۔ ار جولائی کو اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ۱۱ جولائی کو انکے اپنے گاؤں امردیا ضلع بنارس میں تدفین عمل میں آئی۔ اللہ تعالیٰ مرحومہ کی مغفرت فرمائے۔ انہیں جنت میں جگہ دے۔ اور متعلقین کو صبر جمیل کی توفیق دے۔ انشاء اللہ صالح اولاد انکے لئے بلندیٔ درجات کا ذریعہ بنیں گی۔ انجمن مولانا کے غم میں برابر کی شریک ہے۔

حذف

کلام میں سے غیر ضروری الفاظ کو ساقط کر دینے کا اسلوب حذف کہلاتا ہے۔ غیر ضروری الفاظ سے مراد وہ الفاظ ہیں جن کے بغیر بھی کلام قابلِ فہم رہتا اور سننے والا اس سے متاثر ہوتا ہے۔ کسی بھی گفتگو یا کلام کا حقیقی مقصد یہی ہوتا ہے کہ سامع اسکے مدعا کو سمجھ جائے اور اسکا وہ اثر قبول کرے جو اس گفتگو یا کلام سے دینا مقصود ہے۔ کلام میں اگر ایسے الفاظ داخل ہوں جن کے بغیر بھی کلام کا یہ فائدہ حاصل ہو سکتا ہے تو انکے باعث کلام بلاوجہ طویل اور بوجھل ہو جائے گا اور سننے والا اسکو آسانی سے بھلا دیگا۔ لہٰذا اچھے کلام کیلئے حذف نہایت ضروری ہوتا ہے۔

کلام کے سامعین اپنے فہم اور اثر پذیری کے لحاظ سے الگ الگ مرتبہ کے ہوتے ہیں۔ بعض قومیں اس معاملہ میں دوسری قوموں پر فوقیت رکھتی ہیں۔ اس لئے مختلف زبانوں میں زبان کے اندر حذف کی مقدار میں خاصہ فرق واقع ہوا ہے۔ ہم لوگ اردو میں بات کو طول دینے کے عادی ہیں لیکن عرب نہایت تیز فہم اور انکے ذہن بیدار تھے اسلئے غیر ضروری طور پر طویل کلام انکو بوجھل محسوس ہوتا تھا۔ وہ ایسے کلام کو پسند کرتے جو مختصر لیکن مدعا کو حاصل کرنے کیلئے کافی ہوتا۔ اگر کوئی خطیب کلام کے غیر ضروری حصے دور نہ کرتا تو اسکا کلام لوگوں کی نظروں سے گر جاتا اور اسکا سننا انکی سامعہ پر گراں گزرتا۔ جو خطیب بلاوجہ بات کو طول دیئے جاتا لوگ اسکو احمق سمجھتے یا پھر اسکے متعلق انکا خیال ہوتا کہ وہ انکو کند ذہن اور احمق سمجھ کر بات کر رہا ہے۔ یہ دونوں صورتیں انکو پسند نہ تھیں۔ اپنی اسی ذکاوت کے باعث عربوں نے اپنی زبان کی اہم خصوصیت یہ رکھی کہ حذف کا اسلوب اسمیں نمایاں ہوا۔

عربی زبان میں حذف کئی پہلوؤں سے نمایاں ہوا ہے جنمیں سے بعض بآسانی نگاہ میں آجاتے ہیں۔

ا۔ جسطرح عبرانی زبان میں نقطوں اور حرکات کا تصور نہیں تھا لیکن اسکے باوجود وہ پڑھی جاتی تھی اسی طرح عربی زبان میں بھی نقطے لگانے اور حرکات ظاہر کرنے کا کوئی تصور نہ تھا۔ عربوں نے اپنی کسی ضرورت کیلئے نقطے اور حرکات لگانے کا کام نہیں کیا بلکہ جب اسلام عجمیوں میں پھیلا اور ان کو

قرآن مجید کی تلاوت میں دقت محسوس ہوئی قرآن کی سہولت کیلئے پہلے نقطے لگا کر حروف کو ایک دوسرے سے ممیز کیا گیا اور پھر حرکات ایجاد کی گئیں جن کی مدد سے عجمی لوگ قرآن پڑھنے پر قادر ہو سکیں۔

ب۔ عرب جب حروف کو ملا کر کوئی مرکب لفظ لکھتے تو بیشتر حروف کی شکل کا کچھ حصہ حذف کر دیتے اور اسکے باقی حصہ ہی پر قناعت کرتے۔ مثال کے طور پر ع م ر کو ملا کر لکھنے کی صورت میں ع اور م کا محض سر لکھ لینا کافی سمجھا گیا اور اسکو عمر کی صورت میں لکھا گیا۔ اسی طرح ا ل ت ی ن میں سے کچھ حروف کا ابتدائی حصہ لے کر مرکب صورت میں اسکو عربوں نے التین لکھا۔ بعد میں جب عجمیوں کے لئے نقاط فراہم کئے گئے تو یہ لفظ "التین" کے طور پر لکھا جانے لگا۔ عربی میں کتاب کو کتب اور رحمان کو رحمن لکھا گیا یعنی دونوں لفظوں میں الف کو حذف کر دیا گیا حالانکہ وہ پڑھنے میں آتا ہے۔

ج۔ عربوں نے کلام کے دو حصوں کو جوڑنے والے حروف کی بالعموم ضرورت محسوس نہیں کی۔ مثال کے طور پر اضافت یعنی ایک چیز کے دوسری چیز کیساتھ تعلق کو بتانے کے لئے ہم اردو میں کا، کے، کی میں سے کوئی حرف استعمال کرتے ہیں لیکن عربی میں یہ اضافت بغیر کسی زائد حرف کے ظاہر ہوتی ہے۔ مثلاً احمد کی کتاب، کتاب احمد، گھوڑے کے دو کان، اذنا فرس۔ اسی طرح جملے یا الفاظ میں کسی ابہام کو دور کرنے کے لئے جو وضاحت کی جاتی ہے اور جسکو تمیز کہتے ہیں عربی میں اس کے لئے اصل وضاحت سے زائد کوئی حروف نہیں بڑھائے جاتے جبکہ اردو میں اس کے بغیر کام نہیں چلتا۔ مثلاً اردو میں کہا جائے گا، سلیم نسب کے لحاظ سے شریف ہے۔ عربی میں کہیں گے سلیم شریف نسبًا۔ نسب کے لحاظ سے، کا مفہوم محض لفظ نسب کے اعراب سے ادا ہو جاتا ہے۔ الفاظ کی یہی کیفیت ضمیر، حال، ظرف وغیرہ کے استعمال میں بھی نظر آتی ہے۔ دوسری زبانیں اس خصوصیت سے تہی داماں ہیں۔ صرف عربی نے زبان کے ارتقا میں یہ رفعت حاصل کی ہے۔

د۔ عربوں نے جملوں کے دروبست میں سے اتنا حصہ نکال دیا جو قرینہ سے سمجھ میں آجاتا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ کلام میں کبھی مبتدا غائب ہوتا ہے تو کبھی خبر کہیں فعل بیان نہیں ہوتا کہ قاری موقع و محل کی روشنی میں خود اس تک رسائی حاصل کر سکتا ہے، کہیں شرطیہ جملے کا جواب غائب ہوتا ہے

یا الفاظ قسم کے بعد مقسوم علیہ کے الفاظ محذوف ہوتے ہیں۔ حذف کی یہ شکلیں اسی موقع پر اختیار کی جاتی ہیں جہاں سیاق و سباق اس حذف کے مقدر معنی تک رہنمائی کر رہا ہوتا ہے۔

۵۔ اہل عرب کوئی قصہ بیان کرتے ہیں تو اس میں سے بعض غیر ضروری تفصیلات کو نکال دیتے ہیں۔ جب دلیل بیان کرتے ہیں تو اسکے ایسے مقدمات کو حذف کر دیتے ہیں جنکو حذف کرنے کی جرأت دوسری قومیں کبھی نہیں کرتیں۔ عربی کی جن مشکلات کے باعث اہل عرب کے کلام کو سمجھنا غیروں کے لئے بہت مشکل ہوا، اسکا ایک سبب اسی طرح کے محذوفات ہیں۔

قرآن مجید میں حذف کا اسلوب عام استعمال ہوا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہم اس سے واقفیت حاصل کریں۔ اس اسلوب سے ناواقف آدمی کلام کے صحیح مفہوم تک رسائی نہیں پاتا اور اگر حذف سے واقف ہے لیکن اسکے مقدر معانی کے کھولنے میں غلطی کر دیتا ہے تو وہ کلام کے معانی ہی کو بدل کر رکھ دیتا ہے۔ لہٰذا اس اسلوب کو سمجھنے کی ضرورت اس سے کہیں زیادہ ہے جتنی بظاہر نظر آتی ہے۔

حذف مبتدا و خبر عربی میں سادہ ترین جملہ مبتدا و خبر (جن کو مسند الیہ و مسند بھی کہتے ہیں) سے مل کر بنتا ہے۔ کلام میں اس ترکیب کے جملوں میں سے کبھی مبتدا کو اور کبھی خبر کو محذوف کر دیا جاتا ہے۔ اسکی وجہ یہ ہوتی ہے کہ کلام کا محذوف حصہ اس قدر واضح ہوتا ہے کہ جملہ کا در و بست خود اس کی غمازی کر رہا ہوتا ہے اور قاری بغیر کسی اشتباہ کے اس تک پہنچ جاتا ہے۔ اسکی دوسری وجہ یہ ہوتی ہے کہ مبتدا کو حذف کر کے خبر پر اور خبر کو حذف کر کے مبتدا پر قاری کی پوری توجہ مرکوز کر دینا مطلوب ہوتا ہے۔

قرآن مجید میں مبتدا یا خبر کے حذف کا اسلوب بکثرت استعمال ہوا ہے۔ اسکی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

۱۔ منافقین کے ذکر میں بتایا ہے۔

ویقولون طاعة (نساء ۸۱)

"اور یہ کہتے ہیں کہ ہمارا شیوہ سر تسلیم خم ہے۔"

۲۔ فالق الاصباح وجعل الیل سکنا (انعام ۹۶)

"(اللہ ہی) برآمد کرنے والا ہے صبح کا اور اس نے رات سکون کی چیز بنائی۔"

لا یغرنک تقلب الذین کفروا فی البلاد متاع قلیل (آل عمران ۱۹۶)

"ملک میں کافروں کی چلت پھرت تمہیں کسی مغالطہ میں نہ ڈالے۔ (یہ چلت پھرت) چند دنوں کی چاندنی ہے۔"

وما ادرٰک ما الحطمة نار اللہ الموقدة (ھمزہ ۵)

"اور تم کیا سمجھے کہ حطمہ کیا ہے۔ (یہ حطمہ) اللہ کی بھڑکائی ہوئی آگ ہے۔"

حضرت موسیٰ کے قصہ میں ہے کہ جب لوگوں نے ٹوکری کو دریا سے نکلوایا تو اسکے اندر ایک معصوم بچہ پا کر فرعون کی بیوی بہت خوش ہوئی اور فرعون سے مخاطب ہوئی۔ فرمایا۔

وقالت امرات فرعون قرة عین لی ولک (قصص ۹)

"اور فرعون کی بیوی نے کہا (یہ بچہ) میری اور تمہاری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔"

مندرجہ بالا تمام آیات میں مبتدا حذف ہے جس کا تعین موقع و محل سے ہو جاتا ہے۔ ترجمہ کے اندر قوسین میں اس کو کھول دیا گیا ہے۔

جنت کی صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

اکلها دائم وظلها (رعد ۳۵)

"اس کا پھل بھی دائمی اور اس کا سایہ بھی (دائمی ہوگا)۔"

اسی طرح متقیوں کو جنت میں حاصل ہونے والی نعمتوں کے تذکرہ کے بعد فرمایا۔

هذا وان للطاغین لشر مآب (ص ۵۵)

"یہ تو متقیوں کے لئے ہوں گی) اور سرکشوں کیلئے نہایت برا ٹھکانہ ہوگا۔"

حضرت موسیٰ کے قصہ میں جادوگروں کو ایمان لانے پر قتل کی دھمکی کا بیان ہوا ہے۔ اس کے بعد ہے۔

قالوا لا ضیر انا الی ربنا منقلبون (شعراء ۵۰)

"انہوں نے جواب دیا (ہمیں قتل کا) کوئی ڈر نہیں۔ ہم اپنے رب ہی کی طرف لوٹیں گے۔"

مذکورہ تینوں مثالوں میں خبر محذوف ہے جو موقع و محل سے بآسانی معلوم ہو جاتی ہے۔ اس کو قوسین میں کھول دیا گیا ہے۔

۹۔ ان الذین کفروا ویصدون عن سبیل اللہ والمسجد الحرام الذی جعلنه للناس سواء العاکف فیه والباد (حج ۲۵)

"بے شک جن لوگوں نے کفر کیا اور وہ لوگوں کو اللہ کی راہ سے اور اس مسجد حرام سے جس کو ہم نے لوگوں کے لیے یکساں بنایا، خواہ وہ اس کے شہری ہوں یا آفاقی روکتے ہیں، تو انہوں نے بہت بڑے ظلم کا ارتکاب کیا۔"

اس جملہ میں خبر ایک طویل جملہ پر مشتمل ہے۔ اس طرح کے حذف کو سیاق و سباق پر اچھی طرح غور کر کے متعین کرنا پڑتا ہے۔ غور کے بغیر جملہ کا مفہوم سمجھنے میں غلطی کا امکان ہوتا ہے۔

۱۰۔ حضرت ابراہیم کے ذکر میں آیا ہے کہ ایک مرتبہ انکے پاس کچھ اجنبی بطور مہمان آئے اور انکو سلام کیا اس کے بعد آتا ہے۔

قال سلام قوم منکرون (ذاریات ۲۵)

"ابراہیم نے کہا (تم پر بھی) سلام ہو۔ پھر سوچا یہ مہمان) اجنبی لوگ ہیں۔" اس آیت کے واضح طور پر دو حصے ہیں۔ پہلے میں خبر محذوف ہے اور دوسرے میں مبتدا کو حذف کر دیا گیا ہے۔

بسا اوقات آیات میں کوئی جملہ ایسا بھی آ گیا ہے جس کو مبتدائے محذوف کی خبر بھی قرار دے سکتے ہیں اور خبر محذوف کا مبتدا بھی۔ دونوں صورتوں میں کلام کے مدعا میں کوئی خاص فرق واقع نہیں ہوتا۔ اسکی دو مثالیں ملاحظہ ہوں۔

۱۱۔ منافقین کے بارے میں بتایا ہے کہ وہ قسمیں کھا کھا کر تم سے وعدہ کرتے ہیں کہ آئندہ تمہارے ہمراہ ضرور جنگ کے لیے نکلیں گے۔ پھر فرمایا۔

قل لا تقسموا طاعۃ معروفۃ (نور ۵۳)

"ان سے کہو قسمیں مت کھاؤ، دستور کے مطابق اطاعت مطلوب ہے۔"

بعد کے جملے کا ترجمہ یوں بھی ہو سکتا ہے: "صحیح طریقہ دستور کے مطابق اطاعت کرنا ہے۔" اس طرح طاعۃ معروفۃ میں مبتدا بننے کی صلاحیت بھی ہے اور خبر بننے کی بھی۔

۱۲۔ برادران یوسف نے جب اپنے والد ماجد کو یوسف کے قتل ہو جانے کی کہانی سنائی تو انہوں نے فرمایا

بل سولت لکم انفسکم امرا فصبر جمیل (یوسف ۱۸)

"یہ تو تمہارے جی کی گھڑی ہوئی ایک بات ہے تو (میرا شیوہ) صبر جمیل ہے۔"

آیت کے آخری حصہ کا ترجمہ یوں بھی ہو سکتا ہے تو صبر جمیل (بہتر عمل) ہے۔ دونوں صورتوں میں مفہوم میں زیادہ فرق واقع نہیں ہوتا۔ (شکریہ تدبر لاہور پاکستان)

احمد امین اور ان کی خود نوشت سوانح حیات

• محمد سلطان اصلاحی۔ شعبہ عربی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

احمد امین کا شمار جدید مصر کے ممتاز اور منفرد ادیبوں میں ہوتا ہے وہ مصر کے ایک گاؤں سوالط میں یکم اکتوبر ۱۸۸۶ء کو پیدا ہوئے[1]۔ ان کے والد انتہائی متقی، دیندار اور علم دوست تھے۔ انھیں اپنی اولاد کی بہترین تربیت اور اعلی تعلیم کا بیحد خیال تھا[2]۔ چنانچہ پانچ سال کی عمر میں انھوں نے احمد امین کو ایک مکتب میں داخل کر دیا جہاں کا ماحول خالص مذہبی ماحول تھا۔ عام مکاتب کی طرح یہاں بھی صفائی ستھرائی وغیرہ کا معقول نظم تھا۔ دس سال کی عمر میں انھیں ایک جدید طرز کے اسکول میں داخل کر دیا گیا جہاں تمام جدید سہولیات فراہم تھیں اور جدید مضامین مثلاً جغرافیہ، تاریخ اور حساب وغیرہ داخل نصاب تھے۔ چودہ[3] برس کی عمر میں انکے والد نے انھیں ازہر میں داخل کر دیا۔ وہ یہاں کے جامد علمی ماحول اور کٹر دینی فضا سے مطمئن نہیں تھے لیکن والد کے دباؤ کی وجہ سے انھیں مجبور ہونا پڑا[4]۔

ازہر میں کچھ دنوں تعلیم حاصل کرنے کے بعد انھیں طنطا کے ایک مدرسے میں عربی پڑھانے کا موقع مل گیا۔ لیکن رہائش وغیرہ کے معقول نظم نہ ہونے کی وجہ سے یہ قاہرہ واپس لوٹ آئے[5]۔ اسی دوران انھوں نے مصری یونیورسٹی کے ایک کالج میں داخلہ کی کوشش کی لیکن کامیابی نہیں ملی خوش قسمتی سے انھیں اسکندریہ کے مدرسہ راتب پاشا میں تدریسی خدمات انجام

[1] حیاتی، احمد امین ص ۱۲، مکتبۃ الآداب قاہرہ ۱۹۵۲ء [2] ایضاً ص ۱۷ [3] ایضاً ص ۵۳-۵۵
[4] ایضاً ص ۶۶-۶۷

دینے کے لئے تقرر مل گیا۔ جہاں کے پرسکون اور علمی ماحول میں مطالعہ اور غور و فکر کے لئے کافی فرصت ملی۔ یہاں انھیں شیخ عبدالحکیم بن محمد کی ملاقات کا شرف بھی حاصل ہوا جو گوناگوں علمی دینی صلاحیتوں کے مالک تھے۔[1]

احمد امین اعلیٰ تعلیم کے لئے بے حد فکرمند تھے اس لئے تدریس میں پوری دلچسپی کا اظہار نہیں کر پا رہے تھے چنانچہ ۱۹۰۷ء میں جب مشہور مصری زعیم سعد زغلول نے مدرسۃ القضاء الشرعی کے قیام کا اعلان کیا تو انھوں نے اس میں فوراً داخلہ لے لیا۔ اس اسکول میں دینی علوم کے ساتھ عصری علوم کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ مصر کے معروف عالم اور منتظم عاطف برکات اس اسکول کے پرنسپل تھے۔ احمد امین نے مدرسہ کی تعلیم، اس کے علمی ماحول اور پرنسپل کی شخصیت سے مکمل استفادہ کیا۔[2]

مدرسے سے فراغت کے بعد انھیں اسی میں تدریس کے لئے منتخب کر لیا گیا۔ یہ اخلاق، تاریخ، فقہ اور منطق پر لکچر دیا کرتے تھے۔ انگریزی سیکھنے کا موقع بھی انھیں اسی دوران حاصل ہوا۔ مدرسے کے اساتذہ مختلف یونیورسٹیوں اور کالجوں کے تعلیم یافتہ تھے۔ ان کی علمی صلاحیتیں بھی مختلف نوعیتوں کی تھیں۔ ان کے ساتھ رہ کر احمد امین کو اپنی فکری علمی نشو و نما میں کافی مدد ملی۔ ان احباب ہی کے تعاون سے انھوں نے ۱۹۱۳ء میں "لجنۃ التالیف والترجمۃ والنشر" کے نام سے ایک تحقیقی ادارہ قائم کیا جس کے وہ تاحیات ڈائرکٹر رہے۔ اس ادارے سے نکلنے والے رسالہ "الثقافۃ" کی ایڈیٹرشپ بھی ان ہی کے حصہ میں رہی۔[3]

۱۹۲۶ء میں جب کہ وہ بعض سیاسی اسباب کی وجہ سے مدرسۃ القضاء سے الگ ہو کر ازبکیہ میں قضاء کے فرائض انجام دے رہے تھے ڈاکٹر طہٰ حسین نے انھیں فواد یونیورسٹی میں تدریسی

---

[1] حیاتی، احمد امین ص ۷۸ - [2] ایضاً ص ۸۶ - ۱۰۸

[3] حیاتی احمد امین ۱۵۵

خدمات انجام دینے کی دعوت دی جسے انھوں نے معمولی پس و پیش کے بعد قبول کر لیا۔ یہاں انھیں فقہ کے ساتھ ادب، لغت اور گرامر پڑھانے کا موقع ملا۔ یونیورسٹی میں موجود یورپی اساتذہ سے بھی انھیں کافی فائدہ پہنچا۔ مستشرقین کے طریقہ بحث و تحقیق سے براہ راست واقفیت کے بعد ان کی فکری زندگی میں واضح تبدیلیاں آئیں اور بحث و نظر کی نئی راہیں کھلیں جس کا اندازہ ان کی تصنیفات مثلاً فجر الاسلام، ضحی الاسلام، ظہر الاسلام اور یوم الاسلام وغیرہ سے بآسانی کیا جا سکتا ہے۔ یونیورسٹی میں آنے کے بعد مختلف علمی فرضیات کے تحت انھیں عرب اور بیرونِ عرب سفر کا موقع ملا جہاں مختلف کانفرنسوں میں اپنے تحقیقی مقالات پیش کئے۔ یونیورسٹی میں ان کی علمی سرگرمیوں کی قدر کی گئی۔ چنانچہ یکم اپریل ۱۹۳۹ء کو انھیں ڈین فیکلٹی آف آرٹس بنا دیا گیا۔ یہ ان کے لئے بہت بڑا علمی اعزاز تھا۔[1] یونیورسٹی میں تدریس کے دوران انھیں مختلف اکیڈمیوں اور انجمنوں نے اپنی ممبرشپ عطا کی، جن میں "المجمع العلمی بدمشق" اور "مجمع اللغۃ العربیۃ القاہرہ" قابل ذکر ہیں۔[2]

اپنی علمی جد و جہد اور لگن کی وجہ سے انھوں نے ان سب کا حق ادا کیا۔ ۱۹۴۸ء میں انھیں مجلس کلیۃ الآداب اور مجلس جامعہ فواد اول نے ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری عطا کی۔ مصری حکومت نے ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے جائزہ فواد اول عطا کیا۔[3]

الغرض احمد امین کی پوری زندگی علم و ادب کی خدمت میں گزری۔ تصنیف و تالیف ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ محنت، جانفشانی، صبر، استقلال، آزادیٔ فکر اور آزادیٔ عمل ان کی زندگی کی نمایاں خصوصیات تھیں۔ مسلسل جد و جہد کی وجہ سے ان کے قویٰ مضمحل اور اعضاء جواب دے چکے تھے۔ آخرکار ۳۰ جون ۱۹۵۴ء کو علم و ادب کا یہ تابناک ستارہ ہمیشہ کیلئے قاہرہ کے افق پر غروب ہو گیا۔[4]

---

[1] الی الثقافۃ والتجدید، انور الجندی ص ۲۸۳

[2] ایضاً ۲۰۷ - ۲۴۶ [3] ایضاً ص ۲۵۵ - ۲۵۹

[4] تحقیق المجمع العلمی ۳/ ۲۹ ص ۴۳۹

[5] ایضاً ص ۴۷۰

گرچہ احمد امین کو ادب، تاریخ، تنقید، فقہ اور نقد میں ملکہ حاصل تھا لیکن ادب اور تاریخ میں ان کو سب سے زیادہ شہرت حاصل ہوئی۔ فکری تنقید میں ان کی کتاب "النقد الادبی" کا نام ضرور لیا جاتا ہے لیکن زیادہ تر اخذ و استفادہ پر مشتمل ہے۔ ان کی تصنیفات میں ضحی الاسلام، فجر الاسلام، یوم الاسلام اور ظہر الاسلام کو جدید دور کا علمی و ادبی شاہکار مانا جاتا ہے۔ ان تصانیف میں انھوں نے اسلام کی فکری، علمی اور ثقافتی تاریخ کو انتہائی اچھوتے، دلنشیں اور سلیس انداز میں پیش کر دیا ہے۔ ادب کے پہلو سے اُن کی کتاب "حیاتی" سر فہرست ہے۔ یہ ان کی خود نوشت سوانح حیات ہے۔ یہ مقالہ اُس کے تعارف پر مشتمل ہے۔

احمد امین کی کتاب "حیاتی" در اصل ان کی خود نوشت سوانح حیات ہے۔ یہ اُن کی اُن یادداشتوں کا مجموعہ ہے جو وہ وقتاً فوقتاً لکھا کرتے تھے۔ بعد میں ان ہی یادداشتوں کو انھوں نے کتابی شکل دے دی۔ احمد امین اس کتاب کے مقدمے میں خود اُس کی وضاحت کرتے ہیں۔

"اپنی زندگی کی تاریخ لکھنے کا خیال مجھ کو بچپن سے دامنگیر رہا ہے۔ چنانچہ میں اپنے سفر کی روداد، خاندان میں اپنے نجی احوال اور ہر سال کے اہم اچھے برے واقعات کی تفصیلات برابر لکھتا رہا۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ میرا یہ عمل کسی نظم کا باقاعدہ پابند نہیں تھا ان میں کچھ وقفے بھی ہو جایا کرتے تھے۔ پھر میرے ذہن میں ان واقعات کی باقاعدہ ترتیب کا خیال پیدا ہوا۔ چنانچہ بچپن سے لیکر بڑھاپے تک کے واقعات کو یاد کرنے کیلئے میں نے ذہن پر زور ڈالا۔ جب مجھے کوئی نیا واقعہ یاد آجاتا تو میں اسے انتہائی اختصار کے ساتھ بلا کسی ترتیب کے نقل کر دیتا۔ جب میں اس سے فارغ ہو گیا تو اپنی پہلے کی لکھی ہوئی یادداشتوں کو نکالا اور ان دونوں کو سامنے رکھ کر اس نئے انداز میں ترتیب دے دیا جس کو آج آپ دیکھ رہے ہیں"[1]

---

[1] مقدمہ، حیاتی، احمد امین ص ۶

اس کتاب میں احمد امین نے بچپن سے لے کر بڑھاپے تک کے اہم واقعات کو مرتب کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس طرح یہ کتاب ان کی علمی زندگی کی تاریخ بن جاتی ہے اُنکی زندگی یقیناً مرتب کیے جانے کے لائق تھی عصر حاضر میں جو تجربات مختلف سطحوں پر انھیں حاصل ہوئے وہ اس دور کے بہت سے ادباء اور انشاپردازوں کو حاصل نہیں ہو سکے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ احمد امین نے اس کتاب میں بچپن، گھر، خاندان، والدین، اعزہ و اقرباء، ابتدائی مدارس، جامعہ ازہر، دوست و احباب، اساتذہ، سفرنامے، علمی ارتقاء، تجربات، ملازمت، غرض الغرض تمام چیزوں کی تفصیلات انتہائی سلیس اور دلنشیں انداز میں بیان کر دی ہیں۔ اس کتاب کا ہر اقتباس پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ طوالت سے گریز کرتے ہوئے یہاں صرف ایک اقتباس پیش کیا جا رہا ہے وہ اسکندریہ میں اپنے عربی شیخ عبد الحکیم سے ملاقات اور ان سے اخذ و استفادہ کے بعد اپنے تاثرات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں۔

"ان کی ملاقات نے میری خامیوں کو دور کر دیا میرے نفس میں وسعت پیدا کر دی اور میرے افق کو روشن کر دیا۔ میں کتاب کے علاوہ اور کوئی دوسری چیز نہیں جانتا تھا انھوں نے مجھ کو بتایا کہ دنیا کتاب میں نہیں ہے"[1]

"مجھ پر غنودگی طاری تھی۔ انھوں نے مجھ کو بیدار کر دیا۔ میں اندھا تھا انھوں نے مجھ کو بصیرت بخشی اور تقلید کا عادی تھا انھوں نے مجھے آزادی سے روشناس کرایا"[2]

پوری کتاب اسی انداز میں لکھی گئی ہے کتاب کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں بیک وقت عقل کی چمک دمک، جذبات کا اضطراب اور فن کی رنگ آمیزیاں شامل ہیں۔ انیس المقدسی اس کتاب کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"احمد امین کی یہ کتاب اُن یادداشتوں کا مجموعہ ہے جنھیں وہ وقتاً فوقتاً لکھا کرتے تھے پھر جب وہ اپنی زندگی کے آخری مرحلے میں داخل ہوئے تو انھیں یکجا کر دیا۔ اب یہ ایک کتاب

---

[1] حیاتی، احمد امین ص ۷۷ [2] ایضاً ص ۷۸

کی شکل میں انتہائی شاندار اسلوب، نادر وصف اور سچے لہجہ میں منظر عام پر آئی ہے۔ مطالعہ کرنے والا جب ان کا مطالعہ کرتا ہے تو وہ دیکھتا ہے کہ مؤلف کی پرورش، پرداخت نشو ونما اور مختلف مراحل و ارتقا کا عمل کیسے مکمل ہوا اور کیسے اُس نے دنیائے علم و ادب میں ایک شاندار مقام بنا لیا[1]

"حیاتی" کے بارے میں ایک عام خیال یہ ہے کہ اس کی ترتیب و تدوین میں ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی کتاب کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ دونوں کی سیرت میں کافی مشابہت ہے۔ دونوں کی پرورش ایک ایسے ماحول میں ہوئی جس پر جدید تہذیب و تمدن کی روشنی نہیں پڑتی تھی۔ دونوں نے پہلے ازہر میں تعلیم حاصل کی اور جبہ و عمامہ پہنا لیکن پھر اسے اتار پھینکا اور عصری زندگی میں داخل ہو گئے۔ اس طرح دونوں نے عصری بود و باش چھوڑ کر جامعی بود و باش اختیار کر لیا۔ اور دونوں نے اپنی زبان اور اپنی قوم کی گرانقدر خدمات انجام دیں[2]

لیکن طٰہٰ حسین اور احمد امین میں سیرت کے اس اشتراک کے باوجود طرز تالیف اور بعض دیگر امور میں کافی تفاوت ہے۔ احمد امین نے علمی اسلوب میں بات پیش کی ہے اور طٰہٰ حسین نے شعری اسلوب میں۔ دراصل دونوں کی ثقافت اور طبیعت میں کافی فرق تھا طٰہٰ حسین زندگی اور اس کے ہنگاموں سے ربط و تعلق قائم کرکے رہنا پسند کرتے تھے اور احمد امین زندگی سے بھاگتے تھے اور گوشۂ عافیت تلاش کرتے تھے۔ اس کی مزید تفصیل انور الجندی کی زبانی ملاحظہ کیجئے۔

"احمد امین اپنی زندگی کے واقعات کو ایک سچے مورخ کی طرح پیش کرتے ہیں انھیں اس سے کوئی مطلب نہیں ہوتا کہ عبارت کی خوبصورتی اور حسن باقی ہے کہ نہیں، جب کہ طٰہٰ حسین پہلے زندگی کے کچھ واقعات کو لیتے ہیں پھر ان کی ملمع کاری کرتے ہیں اور انھیں الگ کرکے پیش کرتے ہیں[3]

[1] الضوء اللامع، انیس المقدسی ص ۵۷۰۔ [2] ایضاً [3] اضواء علی الادب العربی المعاصر، انور الجندی ص ۵۵

"خلاصہ کلام یہ ہے کہ "الایام" ذات کے گرد گردش کرنے والی ایک طویل گفتگو ہے اور "حیاتی" میں معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے اس لئے کہ اس کے مؤلف کے یہاں نفس سے متعلق گفتگو سخت مشکل کام ہے...... "الایام" میں اسلوب اور شکل و صورت ہے اور "حیاتی" میں قصے اور واقعات ہیں[1]"

استاذ احمد حسن زیات نے "حیاتی" کا مطالعہ کرنے کے بعد اپنے جن تاثرات کا اظہار کیا ہے اُن میں "الایام" پر بھی گفتگو کی گئی ہے۔ بہتر معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ایک اقتباس پیش کر دیا جائے، کیوں کہ احمد حسن زیات کا تعلق طٰہٰ حسین اور احمد امین دونوں سے بہت گہرا رہا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"میں "حیاتی" کو پڑھ کر وہی لذت اور کیف محسوس کر رہا ہوں جو مجھے "الایام" کو پڑھ کر محسوس ہوئی تھی۔ یہ عجیب و غریب قسم کی لذت ہے۔ میں نے اپنی ادبی زندگی میں ان دونوں کتابوں کے مطالعہ سے پہلے ایسی لذت کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ یہ دونوں کتابیں ایک ہی طرز پر لکھی گئی ہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ دونوں اسلوب اور فن کے علاوہ کسی دوسری چیز کے ذریعہ ہمارے دلوں اور احساسات کو موہ لیتی ہیں۔ میرے نزدیک یہ چیز نفسانی جمالی صراحت اور تفصیل ہے[2]"

احمد امین کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ انشا پرداز نہیں تھے بلکہ وہ ایک عالم مورخ اور ادیب تھے۔ احمد امین کی کتاب "حیاتی" پر بھی مذکورہ قول کا اطلاق ہوتا ہے انھوں نے اس میں اپنی سنجیدگی، وقار، علمیت اور تاریخ نویسی کو پوری طرح ملحوظ رکھا ہے اس سلسلے میں عباس محمود عقاد کا یہ تبصرہ بہت موزوں معلوم ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"اکثر سوانح نگار علمی اور فکری مباحث، مسائل اور مشکلات کا سامنا کرنے سے احتراز

[1] اضواء علی الادب العربی المعاصر، انور الجندی ص ۵۷

[2] وحی الرسالہ، احمد حسن زیات ۳/۲۱۱ - ۲۱۲

کرتے ہیں لیکن وہ انشا پرداز جو مسائل حیات اور مسائل علم پر غور کرنے کا عادی ہو چکا ہے وہ اپنی تحریروں میں غور و فکر اور علم و ہنر کے دروازے وا کرے گا خواہ اس نے ایسا قصداً کیا ہو یا سہواً۔ چنانچہ احمد امین نے اس کتاب میں تربیت، ادب اور معاشرت کے بہت سے امور پر گفتگو کی ہے اور یہ گفتگو باقاعدہ ابواب کی شکل میں نہیں بلکہ قصوں، واقعات اور سفرناموں کی تفصیلات کے ضمن میں آگئی ہے۔[1]

احمد امین کی علمی طبیعت اور عقلی مزاج پر انور الجندی اس طرح لکھتے ہیں: "احمد امین اپنی کتاب "حیاتی" میں ادیب کے بالمقابل عالم سے زیادہ قریب ہیں۔ ان کی تمام تحریریں عقلی ہیں وجدانی نہیں۔ انھوں نے اپنے دوست طہ حسین کی طرح جرأت سے کام نہیں لیے۔ مغربی معاشرت انھیں پسند تھی لیکن انھوں نے ہمیشہ مشرقی امانت اور اسلامی فکر کا تحفظ کیا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ انھوں نے مغربی تہذیب کو اپنی آنکھوں سے نہیں بلکہ اپنے مطالعے سے سمجھا تھا۔"[2]

احمد امین نے اپنی کتاب میں عقل اور علم کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ تاریخ کو بھی ملحوظ رکھا ہے۔ ان کی اس کتاب میں مصر کے ایک پورے دور کی تاریخ سمٹ گئی ہے۔ اسی طرح مختلف مقامات پر تبصروں کے ذریعہ مصری معاشرتی زندگی کا ایک بہترین نقشہ ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں حق بات کہنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کے مصنف نے فیصلوں اور احکام کے صدور میں حق و انصاف کے تقاضوں کو اسقدر ملحوظ رکھا ہے جتنا کہ ممکن تھا۔ چنانچہ ان کی تحریروں میں صداقت اور سچائی کا عنصر سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ تاریخی پہلو سے اس کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے استاذ احمد حسن زیات لکھتے ہیں:

"احمد امین کی یہ کتاب (حیاتی) ان کی زندگی کی تاریخ کے ساتھ ساتھ پورے مصر

بقیہ صفحہ ۴۳ پر

[1] بین الکتب والناس، عباس محمود عقاد ص ۴۴

[2] اضواء علی الادب العربی المعاصر، انور الجندی ص ۲۷

دل مضطرب ہیں... غزل

ریاض احمد قاصد جامعۃ الفلاح

(آفاق احمد متعلم عربی دوم جامعۃ الفلاح رمضان المبارک میں سڑک حادثہ کا شکار ہو کر مالک حقیقی سے جا ملے ایسے سانحہ ارتحال پر ان کے ساتھی ریاض احمد قاصد کے تڑپتے جذبات۔)
(ادارہ)

گھر بار اپنا چھوڑ کے ویراں چلا گیا
سینے میں لیکے سینکڑوں ارماں چلا گیا
تھیں جسکے دم سے صحن گلستاں کی رونقیں
افسوس آج وہ گل خنداں چلا گیا
سونی لگے ہے محفل یاراں بہت مجھے
رہتا تھا ہر گھڑی جو غزل خواں چلا گیا
دل مضطرب ہیں سینوں میں آنکھیں ہیں خونفشاں
دیکر وہ سبکو درد بے درماں چلا گیا
آتا نہیں قرار دل بے قرار کو
وہ کیا گیا سکوں کا ساماں چلا گیا
"مل کر رہو نہ جانے کب آئے پیام موت"
قاصد وہ ہم پہ کرکے یہ احساں چلا گیا

ادریس ضیاء کلاتھ مارکیٹ اعلیٰ پور (بدایوں) یوپی

تعلقات تو سب سے نبھائے جائیں
فریب کیسے مگر، دکھائے جائیں
یہ دل کے زخم ہیں، پھولوں کی طرح مہکیں گے
یہ کوئی اشک نہیں جو چھپائے جائیں
چھپائے چھپ نہ سکے گی ضمیر کی پستی
مکان کتنے ہی اونچے بنائے جائیں
تمام عمر بھٹکتی رہے گی یہ — دنیا
ہمارے نقش قدم جو مٹائے جائیں
گھروں میں ان کے ہی نکلے گا لوٹ کا ساماں
اگر گرفت میں یہ رہنما لئے جائیں
وہ ہم سے خوش تو اسی وقت ہو سکیں گے مگر
قلم کو بیچ کے سکے اٹھائے جائیں
مکان شہر میں چاہے کہیں خریدا جائے
پڑوسی پہلے ضیاء آزمائے جائیں

محمد عمران خان فلاحی
استاذ جامعۃ الفلاح

تعارف وتبصرہ

نام میگزین کرنیں نگراں محمد رئیس عثمانی
۱۴۱۳ھ مطابق ۱۹۹۲ء م۔ ضخامت۔ ۱۰۰ صفحے مع ٹائیٹل
مدیر محمد عبدالسلام بستوی فلاحی۔ ناشر۔ مرکزی درسگاہ اسلامی رامپور یوپی پن ۲۴۴۹۰۱

بڑی خوشی کی بات ہے کہ مرکزی درسگاہ اسلامی رامپور نے اپنے میگزین کا سولہواں شمارہ نکالنے میں کامیابی حاصل کر لی ہے اور ۱۹۹۰ء میں جو میگزین بعض مجبوریوں کی وجہ سے شائع نہ ہو سکا تھا اس کی بھی تلافی کر دی ہے۔ یہ درسگاہ لوگوں کے لئے کوئی غیر معروف نہیں ہے ملک کے دور دراز علاقوں سے تشنگان علم نے یہاں آ کر اپنی پیاس بجھائی ہے۔ اور یہاں سے تعلیم وتربیت حاصل کر کے مختلف میدانوں میں کام کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس کو مزید ترقی دے اور کامیابیوں سے ہمکنار کرے یہ سالانہ میگزین بھی انشاء اللہ اس درسگاہ کی مزید نیک نامی کا ذریعہ بنے گا۔ قارئین اسکو پڑھنے کے بعد خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس کے طلبہ کس طرح درسگاہ کے پروگراموں کو کامیاب اور موثر بناتے ہیں۔ اور ہر میدان میں کامیابی وکامرانی حاصل کرتے ہیں۔ کسی درسگاہ کے طلبہ ہی اس کے منہج تعلیم وتربیت کی صحیح رہنمائی کرتے ہیں نہ کہ اس درسگاہ کی عمارتوں کی اینٹ اور پتھر۔ اس میگزین میں چھپے ہوئے بچوں کے مضامین ومقالے دیکھنے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ بچوں نے کافی محنت کی ہے اور انشاء اللہ انکے اندر اچھی صلاحیت پائی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ درسگاہ کے ان سپوتوں کو مزید تعلیم وتربیت کے زیور سے آراستہ کرے اور درسگاہ کو دن دونی رات چوگنی ترقی دے۔

چند قابل توجہ امور

(۱) مولانا عبدالسلام فلاحی صاحب نے جو تین مرحوم بزرگوں کا ذکر کرتے ہوئے ان کے چند کارناموں کا ذکر کیا ہے اس سے قارئین کرام کو کچھ غلط فہمیاں

ہو سکتی ہیں موصوف نے مولانا محمد یوسف صاحبؒ سابق امیر جماعت اسلامی ہند کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا ہے" آپ ہی کے دور امارت میں ہندوستان میں ایمرجنسی کے دوران جماعت پر پابندی لگائی گئی اور قید وبند کی صعوبتوں سے کامیاب وکامران گزرے ہو سکے ایمرجنسی کے ختم ہوتے ہی جماعت کی بحالی کا اعلان ہوا۔ آپ ہی کے دور امارت میں ہندوستان کے مسلم نوجوان طلبہ کی تنظیم اسٹوڈنٹس اسلامک موومنٹ آف انڈیا کا قیام عمل میں آیا آپ ہی کے دور امارت میں جماعت اسلامی ہند کے دو کل ہند اجتماعات منعقد ہوئے" مذکورہ بالا تحریر میں جو یہ عبارت ہے کہ آپ ہی کے دور امارت میں طلبہ تنظیم (S I M) کا قیام عمل میں آیا یہ بات تو اپنی جگہ پر درست ہے لیکن اس سے یہ غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے کہ آپ ہی نے اس تنظیم کو خود قائم کیا یا جماعت کے کسی فیصلے کے تحت ایسا ہوا حالانکہ نہ تو جماعت اسلامی ہند کے کسی فیصلہ کے تحت یہ تنظیم قائم ہوئی اور نہ ہی مولانا محمد یوسف صاحب مرحوم نے ذاتی حیثیت میں ایسا کیا بلکہ اس کے برعکس ایس آئی او آف انڈیا کے قیام کے سلسلہ کی ضروری کارروائیاں باضابطہ طور پر مولانا محمد یوسف صاحب مرحوم ہی کے دور امارت میں ہوئیں۔ اور مولانا ابواللیث صاحب اصلاحیؒ کے دور امارت میں عملاً یہ قائم ہوئی جس کا ذکر مولانا محمد یوسفؒ صاحب کے کارناموں میں ہونا چاہئے تھا اور مولانا ابواللیث اصلاحی صاحب کے کارناموں میں بھی لیکن ان دونوں بزرگوں میں سے کسی کے کارنامے میں اسکا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ اس موقع پر سکریٹری جماعت اسلامی ہند مولانا سید یوسف صاحب کی حسب ذیل عبارت لائق مطالعہ ہے" مولانا کے انتقال کے بعد انکے سلسلہ میں بعض غلط اور بے بنیاد تاثرات سامنے آئے ہیں مثلاً ایس آئی او آف انڈیا کی تشکیل کی بابت یہ درست ہے کہ یہ کل ہند طلبا تنظیم مولانا کے دور امارت میں تشکیل پذیر ہوئی لیکن اس سلسلہ کی ضروری کارروائی باضابطہ طور پر محترم مولانا محمد یوسف صاحب کے دور امارت میں ہو چکی تھی۔ ایس آئی ایم آف انڈیا اور طلبہ کی دوسری اسلامی تنظیموں کے طلبا دونوں ہی جماعت اسلامی ہند کی باضابطہ سرپرستی کے خلاف تھے مگر ایس آئی ایم کا اصرار تھا کہ سرپرستی کا اعلان تنظیم کے دستور میں نہیں بلکہ پالیسی بیان وغیرہ میں ہو جبکہ دوسری طلبا تنظیموں

کا منشور کہ موقف یہ تھا کہ جماعت کی سرپرستی کا، کل ہند طلباء تنظیم کے مجوزہ دستور میں صراحت کے ساتھ اعلان کیا جا سکتا ہے۔ اس مسئلہ میں دونوں کے اختلاف سے جو صورت پیدا ہو گئی اس وجہ سے ایس آئی ایم (S I M) اس کل ہند طلباء تنظیم کا جزء نہ بن سکی جو آگے چل کر ایس آئی او (S I O) کے نام سے تشکیل پذیر ہوئی۔ گفتگوؤں کے دوران جماعت کی مقرر کردہ کمیٹی کے ارکان کی جانب سے جماعت کی نمائندگی ہوتی رہی اور جماعت کی مرکزی مجلس شوریٰ نے جو خطوط متعین کئے تھے، انکے پیش نظر ان طلباء تنظیموں کی کثرت رائے کے مطابق فیصلہ ہوا۔ اس پس منظر کو جانے بغیر ایس آئی او کی تشکیل کی بات کو مولانا مرحوم کے سر تھوپنا، آپ پر سراسر بہتان تراشی ہے۔"[1]

(۲) اس سالانہ میگزین میں بچوں کی تقریریں ومضامین اساتذہ اور دوسرے حضرات کے مضامین کے مقابلہ میں کم ہیں۔ درسگاہ کا میگزین ہونے کی حیثیت سے طلبہ کے مضامین کا تناسب اسمیں زیادہ ہونا چاہئے تھا تاکہ انکی خفتہ صلاحتیں بیدار ہوں انکا حوصلہ بڑھے اور انکی صحیح عکاسی ہو سکے۔ یہ تناسب طلبہ کی ان تقریروں کے شامل کرنے کے بعد ہے جو ۲۰۰۸ء میں منعقد ہونے والے تعلیمی ہفتہ کے موقع پر کی گئی تھیں۔

(۳) رضوان احمد صاحب کے خطبہ صدارت سے واضح ہوتا ہے کہ اس وقت تعلیم وتربیت کا انتظام صرف درجہ آٹھ تک ہے حالانکہ اس سے قبل درجہ دوازدہم تک تعلیم کا نظم تھا۔ یہ امر باعث تشویش ہے کہ درسگاہ ترقی کرنے کے بجائے تنزل کا شکار ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس درسگاہ کو صرف سابقہ معیار ہی پر بحال نہ کرے بلکہ مزید کامیابیوں سے ہمکنار کرے۔

(۴) عربی، ہندی، اور انگریزی زبانوں کی تقریریں اس میگزین میں کم ہیں۔ عربی کی دو، انگریزی کی ایک اور ہندی کی صرف پانچ تقریریں میگزین کی زینت بنی ہیں۔ جو میگزین کے حجم کے لحاظ سے کم تعداد میں ہیں۔ ان زبانوں کی مناسب نمائندگی ہوتی تو اس میگزین کے معیار میں مزید اضافہ ہو جاتا۔

(۵) ترتیب مضامین کے سامنے جو صفحے دیئے گئے ہیں ان میں کافی غلطیاں ہیں۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ یہ کام عجلت اور لاپرواہی سے کیا گیا ہے۔ مشتے از خروارے چند غلطیوں کی طرف یہاں اشارہ کرنا کافی ہوگا

---

[1] ملاحظہ ہو مجلہ حیات نو کی خصوصی پیشکش قائد تحریک اسلامی ہند مولانا ابو اللیث اصلاحیؒ صفحہ ۸۷

(الف) جناب ابو المجاہد زاہد صاحب کی نظم قل ھو اللہ احد صفحہ ۵ پر دکھائی گئی ہے جبکہ وہ صـ۶ پر ہے۔

(ب) جناب مجاہد تکمیم پوری صاحب کی غزل ترتیب میں صـ۷ پر دکھائی گئی ہے جبکہ وہ صـ۸ پر ہے۔

(ج) جناب نفیس صدیقی صاحب کا ترتیب دیا ہوا ڈرامہ حی علی الفلاح فہرست میں صـ۱۹ پر دکھایا گیا ہے حالانکہ وہ صـ۲۹ پر ہے۔

(د) تعلیمی ہفتہ کے موقع پر عربی، ہندی اور انگریزی زبانوں میں کی گئی تقریروں کو فہرست میں صـ۴۳ پر دکھایا گیا ہے جبکہ یہ کئی صفحوں پر مشتمل ہے ہر تقریر کا صفحہ نمبر فہرست میں ہونا چاہئے تھا تاکہ تلاش کرنے میں دقت نہ ہو۔

(۶) چند غلطیاں اس قسم کی بھی پائی جا رہی ہیں کہ بعض تحریریں میگزین کی زینت تو بنی ہوئی ہیں لیکن فہرست میں انکا ذکر نہیں۔

(الف) دعا یہ چند بچوں کی طرف سے پیش کردہ ہے۔ اسکو صـ۲ پر جگہ ملی ہے اور ترتیب میں اسکا ذکر نہیں۔

(ب) اسی طرح صـ۳ پر نعت تو موجود ہے مگر ترتیب مضامین میں اسکا ذکر نہیں ہے۔

بقیہ: احمد امین اور انکے . . . .

کی تاریخ ہے۔ یہ صحیح معنوں میں انیسویں صدی کے ربع آخر میں اور بیسویں صدی عیسوی کے نصف اول کی سچی تاریخ ہے..... اس میں معاشرتی، معاشی، تعلیمی، ثقافتی اور سیاسی تمام امور زیر بحث آگئے ہیں۔[1]

---

[1] وحی الرسالہ، احمد حسن زیات ۳/۲۱۳ مکتبۃ النہضۃ المصریۃ قاہرہ ۱۹۵۵ء

ابن عابد فلاحی

اخبار علمیہ

جامعۃ الفلاح میں ایک اہم سیمنار

ملک کے طول و عرض میں بکھرے ہوئے یہ بے شمار مدارس اپنا شاندار ماضی رکھتے ہیں۔ انہوں نے ملک اور ملت دونوں کو مردان کار فراہم کئے ہیں۔ یہی دین و ایمان کے وہ مضبوط قلعے اور گڑھ ہیں جنہوں نے ہندوستان پر اسپین کی تاریخ دہرانے نہیں دی، لیکن کیا بات ہے کہ ان مدارس نے اب یہ جھل دنیا بڑی حد تک بند کر دیا ہے کیا؟ ان کا ماضی پلٹ کر نہیں آسکتا؟ انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح کو یقین ہے کہ یہ مدارس آج بھی یہ صلاحیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ اس نے اپنے پانچویں اجلاس عام کے موقع پر ایک اہم سیمنار بعنوان "ملک و ملت کی تعمیر اور دینی مدارس" ۲۹ اکتوبر ۱۹۹۲ء کو جامعہ میں منعقد کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ دینی مدارس اور ہندوستان میں فریضہ دعوت اسلامی اور تجدید اسلام کی جدوجہد، نو مسلموں کی تعلیم و تربیت، مدارس نسواں، اصلاح معاشرہ، مدارس میں سائنسی، صنعتی و تکنیکی تعلیم، دینی و عصری اداروں میں باہمی تعلق، ادیان و مذاہب کا تقابلی مطالعہ اور ملک کی فرقہ وارانہ صورتحال، ملی و معاشی امور میں مدارس کا کردار جیسے مسائل نیز فارغین مدارس کی تنظیم، دینی مدارس کا وفاق، اتحاد امت اور اختلاف کے اصول و آداب جیسے اہم امور پر مختلف مسالک و مکاتب کے علماء و دانشور اور مفکرین کے فکر انگیز مقالات سامعین کے سامنے آئیں گے۔ دور نبوی، خلافت راشدہ اور دور اموی و عباسی کے تعلیمی ادارے، دور جدید کے مطابق دینی مدارس کا نصاب اور ہندوستان میں موجودہ تعلیمی تحریکات کا بھی جائزہ لیا جائے گا۔

امید کی جاتی ہے کہ یہ سیمنار مدارس کو ہم آہنگ کرنے اور باہم استفادہ اور افادہ کی راہ کھولنے میں کلیدی کردار ادا کرے گا۔

لندن ہائی کورٹ کا خوش کن فیصلہ

لندن ہائی کورٹ نے مشہور انگریز نو مسلم یوسف اسلام کے قائم کردہ اسکول کے حق میں فیصلہ دیا ہے جسکی بنیاد انہوں نے چند سال قبل لندن کے شمالی علاقے برنٹ میں رکھی تھی۔ لندن ہائی کورٹ نے برطانوی وزیر تعلیم و سائنس کو اپنے ایک فیصلہ میں حکم دیا ہے کہ وہ شمالی لندن میں واقع اسلامیہ اسکول کی اس درخواست پر جسے وہ پہلے مسترد کر چکے ہیں، دوبارہ غور کریں، جس میں اسکول نے حکومتی گرانٹ حاصل کرنے کیلئے اپیل کی تھی۔ فیصلہ سناتے ہوئے جسٹس میکفرسن نے اسلامیہ اسکول کو بہترین ادارہ قرار دیا ہے اور محکمہ تعلیم کے متعلق کہا ہے کہ انہوں نے اسکول کی مئی ۱۹۹۰ء میں سرکاری فنڈز کیلئے اپیل کو مسترد کر کے "ناانصافی" سے کام لیا اور اسکول کے گورنرز کو یہ بھی نہیں بتایا کہ علاقے میں ایک اور اسکول کی گنجائش نہیں ہے۔ مسلمان رہنماؤں اور برطانیہ میں مسلم اسکولوں کے قیام کی تحریک سے متعلق حلقوں نے ہائیکورٹ کے فیصلہ کا خیر مقدم کیا ہے اور اسے ایک طویل جدوجہد میں پہلی کامیابی قرار دیا ہے۔ انہوں نے امید ظاہر کی وزیر تعلیم اور ان کا محکمہ اسلامیہ اسکول کی درخواست کو جلد قبول کرے گا۔

تکبیر ۲۵ جون ۱۹۹۲ء

ایک ضروری اعلان

خریدار حضرات ادارے کو کوئی بھی خط لکھتے وقت اپنے خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔ ڈاک کے نظام کی خرابی کی وجہ سے بعض حضرات کو مجلہ بروقت نہیں پہنچتا ہے۔ اگر کسی کو مجلہ نہ پہنچے تو ادارے کو خط سے مطلع کریں تاکہ دوبارہ مجلہ انکی خدمت میں بھیجا جاسکے۔

منیجر

نور محمد فلاحی سکریٹری انجمن طلبہ قدیم

جامعہ کے لیل و نہار

تعطیل عید الاضحیٰ کے بعد

عید اضحیٰ کے موقعہ پر طلبہ واساتذہ کی اکثریت اپنے گھروں کو روانہ ہوگئی تھی تعطیل ختم ہوتے ہی چند کے علاوہ تمام ہی لوگ وقت پر جامعہ حاضر ہو گئے اور درس وتدریس میں مشغول ہو گئے۔

جلسہ عام

گذشتہ شمارہ میں کلیۃ البنات کی نئی عمارت کے افتتاح کا اعلان تھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ ۱۹ رجون کو بعد نماز جمعہ جامعہ کی مسجد میں پروگرام کا آغاز ہوا۔ اس وقت قرب وجوار کے کثیر تعداد میں لوگ موجود تھے کچھ مہمان حضرات دوسرے اضلاع سے بھی تشریف لائے تھے۔ بعد نماز جمعہ جمعیۃ الطلبہ کی طرف سے طلبہ نے ترانہ جامعہ پیش کیا اور اردو، ہندی، عربی اور انگریزی زبانوں میں تقریریں کیں۔ سامعین حضرات نے انہیں بہت پسند کیا اور کچھ لوگوں نے مقررین کو انعامات پیش کیا۔

رات میں بعد نماز عشاء جامعہ کے احاطہ میں خطاب عام کا پروگرام رکھا گیا جسمیں سب سے پہلے مختلف مقامات سے آئے ہوئے مہمانان گرامی قدر کے سامنے صدر جامعہ جناب مولانا نظام الدین اصلاحی صاحب نے جامعہ کا تعارف پیش کیا اور ملک وبیرون ملک میں اس کا کیا مقام ہے اس سے لوگوں کو باخبر کیا۔ بعدازاں نائب ناظم جامعۃ الفلاح جناب مولانا ابوالبقاء ندوی صاحب نے خطبۂ استقبالیہ پیش کیا۔ اس کے بعد جناب مولانا مقبول احمد فلاحی صاحب ناظم علاقہ گورکھپور اور مولانا خلیل احمد رحمانی صاحب نے تقریریں کیں۔ جسمیں انہوں نے مسلمانوں کی خواہ وہ مرد ہو یا خواتین انہیں انکی ذمہ داریوں کو یاد دلایا پھر دینی تعلیم اور بچے اور بچیوں کی تعلیم کی کتنی اہمیت ہے اس پر روشنی ڈالی۔ اسی موقعہ پر محترم مولانا رفیق احمد قاسمی امیر حلقہ یوپی اور معاون امیر حلقہ محترم حافظ منصور عالم صاحب بھی تشریف فرما تھے

ا؎ اسی وقت میں طالبات نے اپنے یہاں تعلیمی مظاہرہ پیش کیا اور خواتین سے محترمہ آسیہ فلاحی صاحبہ نے خطاب کیا

محترم امیر حلقہ بھی خطاب فرمایا۔ آخر میں طلبہ جامعہ نے جہاد افغانستان سے متعلق ایک تمثیلچہ پیش کیا جس میں انجینیر گلبدین حکمت یار نے ایک پریس کانفرنس بلائی تھی اسمیں دنیا کے اہم ممالک اور نمایاں اخبارات کے نمائندے شامل تھے۔ لوگوں نے اسے بہت پسند کیا۔

محترم مولانا صدر الدین اصلاحی صاحب کی جامعہ پر آمد

اعلان کے مطابق ۲۰ رجون کو کلیۃ البنات کی نئی درسگاہ کا افتتاح تھا مشہور عالم دین اور عظیم مفسر قرآن محترم مولانا صدر الدین اصلاحی صاحب اپنی شدید علالت کے باوجود صبح آٹھ بجے سے پہلے جامعہ تشریف لائے۔ نئی درسگاہ کے ایک حصہ میں مردوں کے لیے نظم تھا اور دوسری طرف طالبات و خواتین کیلئے انتظام تھا۔ کثیر تعداد میں خواتین موجود تھیں۔ اور طلبہ واساتذہ اور دیگر مہمان حضرات بھی موجود تھے۔ محترم مولانا کی تذکیر اور مولانا خلیل احمد رحمانی صاحب کے درس حدیث سے نئی عمارت کا افتتاح ہوا اسکے بعد مختلف حضرات کے تعاون کا اعلان کیا گیا اور دعا پر پروگرام ختم ہوا۔ اللہ تعالیٰ اس عمارت کو طالبات کی تعلیم وتربیت کے لئے زیادہ سے زیادہ مفید بنائے۔ آمین۔

انجمن طلبہ قدیم کی طرف سے پیشکش

افتتاح کے موقعہ پر بہت سے اہل خیر حضرات کی اعانتوں کا اعلان کیا گیا طالبات و خواتین نے نقدی اور زیورات کی شکل میں اپنا تعاون پیش کیا انجمن طلبہ قدیم کی طرف سے کلیۃ البنات کے لئے تعمیر ہونے والی لائبریری کے لئے مبلغ ایک لاکھ روپے کی کتابوں کے فراہمی کی پیشکش کی گئی۔ اللہ تعالیٰ ان کتابوں کی فراہمی کیلئے آسانیاں فراہم کرے۔ آمین۔

معزز مہمانوں کی آمد

اس ماہ حیدرآباد سے محترم انوار الحسن انجینیر کی رہنمائی میں پانچ معزز مہمانوں پر مشتمل ایک وفد جامعہ تشریف لایا۔ اس میں ایک کے علاوہ سبھی انجینیر حضرات تھے۔ انہوں نے جامعہ کو تفصیل سے دیکھا کلیۃ البنات کے نئے کمپلکس کا مشاہدہ کیا۔ انشاء اللہ

ا؎ تلاوت کلام پاک کے بعد محترم ڈاکٹر خلیل احمد صاحب ناظم جامعۃ الفلاح نے افتتاحی کلمات کیساتھ مجوزہ کمپلکس کا تفصیلی تعارف پیش کیا جسکی تفصیل آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں۔

انہیں حضرات کی نگرانی میں طالبات کیلئے دارالاقامہ اور مرکزی لائبریری وغیرہ کی تعمیر عمل میں آئے گی۔ یہ معزز مہمان بہت ہی مصروف لوگ ہیں انہوں نے اپنے قیمتی اوقات کو جامعہ کیلئے لگایا۔ جو جامعہ سے انکے خلوص وہمدردی کی علامت ہے۔ اللہ تعالیٰ انکے خلوص کو قبول فرمائے اور انہیں مزید اضافہ فرمائے۔ آمین۔

۱۵ جولائی کی شام میں یوپی کی رابطہ کمیٹی کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر امان اللہ خاں صاحب کی رہنمائی میں ایک وفد یہاں پہنچا ایک رات جامعہ میں قیام رہا۔ بلریاگنج قصبہ اور اطراف کے معزز افراد سے انکی گفتگوئیں رہیں۔ وفد نے اپنی آمد اور دورے کی غرض وغایت لوگوں کے سامنے رکھی۔ صبح یہ قافلہ مبارکپور کے لئے روانہ ہوگیا۔

انجمن کے اجلاس عام کی تیاری

ہر دو ہفتے پر مقامی ارکان شوریٰ اور فلاحی حضرات مل بیٹھتے ہیں اور اجلاس کے مختلف کاموں پر غور وخوض کرتے ہیں اور کچھ رائیں اور مشورے دیتے ہیں۔

اسلامی تاریخ سنہ ہجری کا نفاذ

مقامی شوریٰ انجمن نے یہ طے کیا ہے کہ اسکے آرگن مجلہ حیات نو کو جن حضرات کی خدمات حاصل ہیں انکی رخصتوں اور تعطیلات نیز انکے حسابات کا تعلق قمری مہینوں اور سنہ ہجری سے رکھا جائے۔

جامعہ میں ششماہی امتحانات

طلبہ واساتذہ سبھی اسباق کو پڑھنے پڑھانے اور کورس کی تکمیل میں مصروف ہیں۔ تقریباً تعلیم کے نصف سال ہونے جارہے ہیں۔ انشاء اللہ ششماہی امتحانات اگست کی آخری تاریخ سے شروع ہوجائیں گے۔ امتحانات کے بعد تعطیل ہوتی ہے جس میں سبھی طلبہ اپنے گھروں کو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس امتحان کی تیاری کے ساتھ ساتھ آخری امتحان کی تیاری کی توفیق بخشے۔ آمین۔

جناب مولانا نعیم الدین اصلاحی صاحب کو صدمہ

مولانا نعیم الدین اصلاحی، استاذ جامعۃ الفلاح

بقیہ ص ۲۵ پر

"قائد تحریک اسلامی ہند" نمبر کا دوسرا ایڈیشن

مولانا ابو اللیث صاحب اصلاحی ندوی کے حالات زندگی اور خدمات پر مشتمل حیات نو کی خصوصی پیشکش "قائد تحریک اسلامی ہند" نمبر ضروری تصحیح کے بعد دوبارہ منظر عام پر آچکا ہے۔ خواہش مند حضرات جلد رابطہ قائم کریں۔

قیمت: ۱۵ / روپے

"مولانا سید حامد حسین نمبر"

ماہنامہ "حیات نو" کی خصوصی پیشکش "مولانا سید حامد حسین" نمبر کے کچھ شمارے دفتر میں موجود ہیں۔ خواہشمند حضرات اس کی قیمت ۱۲ روپے بھیج کر حاصل کرسکتے ہیں۔

شرح اشتہارات

آخری صفحہ ٹائٹیل		۱۰۰۰
اندرونی صفحہ ٹائٹیل		۶۰۰
آخری صفحہ ٹائٹیل (اندرونی)		۶۰۰
پورا صفحہ	اندرونی	۵۰۰
نصف صفحہ	"	۲۵۰
چوتھائی صفحہ	"	۱۵۰

پتہ: منیجر "حیات نو" جامعۃ الفلاح، بلریا گنج، اعظم گڑھ